منٹو کے سو بہترین افسانے

(افسانے)

حصہ چہارم

Presented by: S A M I

فہرست

شادی
شانتی
شغل
شکاری عورتیں
شوشو
شہ نشین پر
قاسم
قبض
کالی شلوار
کبوتروں والا سائیں
گرم سوٹ
گولی
گورمکھ سنگھ کی وصیت
لال ٹین
لائسنس
ماتمی جلسہ
مجید کا ماضی
محمودہ
مسز ڈی کوسٹا
مسٹر حمیدہ

شادی

جمیل کو اپنا شیفر لائف ٹائم قلم مرمت کے لیے دینا تھا اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں شیفر کمپنی کا نمبر تلاش کیا فون کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کے ایجنٹ میسرز ڈی، جے، سیموئر ہیں جن کا دفتر گرین ہوٹل کے پاس واقع ہے۔

جمیل نے ٹیکسی لی اور فورٹ کی طرف چل دیا۔ گرین ہوٹل پہنچ کر اسے میسرز ڈی، جے، سیموئر کا دفتر تلاش کرنے میں دقت نہ ہوئی بالکل پاس تھا مگر تیسری منزل پر۔

لفٹ کے ذریعے سے جمیل وہاں پہنچا کمرے میں داخل ہوتے ہی چوبی دیوار کی چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے اسے ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی نظر آئی جس کی چھاتیاں غیر معمولی طور پر نمایاں تھیں جمیل نے قلم اس کھڑکی کے اندر داخل کر دیا اور منہ سے کچھ نہ بولا لڑکی نے قلم اس کے ہاتھ سے لے لیا کھول کر ایک نظر دیکھا اور ایک چٹ پر کچھ لکھ کر جمیل کے حوالے کر دی منہ سے وہ بھی کچھ نہ بولی۔

جمیل نے چٹ دیکھی فلم کی رسید تھی چلنے ہی والا تھا کہ پلٹ کر اس نے لڑکی سے پوچھا "دس بارہ روز تک تیار ہو جائے گا میرا خیال ہے"

لڑکی بڑے زور سے ہنسی جمیل کچھ کھسیانا سا ہو گیا "میں آپ کی اس ہنسی کا مطلب نہیں سمجھا۔"

لڑکی نے کھڑکی کے ساتھ منہ لگا کر کہا "مسٹر۔۔۔۔آج کل وار ہے وار۔۔۔۔۔یہ قلم امریکہ جائے گا۔۔۔۔تم نو مہینے کے بعد تپاس کرنا"

جمیل بوکھلا گیا "نو مہینے"

لڑکی نے اپنے بریدہ بالوں والا سر ہلایا۔۔۔جمیل نے لفٹ کا رخ کیا۔

یہ نو مہینے کا سلسلہ خوب تھا۔۔۔نو مہینے۔۔۔اتنی مدت کے بعد تو عورت گل گوتھنا بچہ پیدا کر کے ایک طرف رکھ دیتی ہے۔۔۔نو مہینے۔۔۔نو مہینے تک اس چھوٹی سی چٹ کو سنبھالے رکھو۔۔۔اور یہ بھی کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ نو مہینے تک آدمی یاد رکھ سکتا ہے کہ اس نے ایک قلم مرمت کے لیے دیا تھا۔۔۔ہو سکتا ہے اس دوران میں وہ کم بخت مر کھپ ہی جائے۔

جمیل نے سوچا، یہ سب ڈھکوسلا ہے۔۔۔۔۔قلم میں معمولی سی خرابی تھی کہ اس کا فیڈر ضرورت سے زیادہ روشنائی سپلائی کرتا تھا اس کے لیے اسے امریکہ کے ہسپتال میں بھیجنا صریحاً چالبازی تھی۔۔۔۔مگر پھر اس نے سوچا، لعنت بھیجو جی اس قلم پر۔۔۔امریکہ جائے یا افریقہ اس میں شک نہیں کہ اس نے یہ بلیک مارکیٹ سے ایک سو پچھتر روپے میں خریدا تھا۔۔۔۔مگر اس نے ایک برس اسے خوب استعمال بھی کیا تھا۔۔۔۔ہزاروں صفحے کالے کر ڈالے تھے۔۔۔۔ چنانچہ وہ تنوطی سے ایک دم رجائی بن گیا اور رجائی بنتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ فورٹ میں ہے اور فورٹ میں شراب کی بے شمار دکانیں ہیں تو ظاہر ہے نہیں ملے گی لیکن فرانس کی بہترین کونک برانڈی تو مل جائے گی، چنانچہ اس نے قریب والی شراب کی دکان کا رخ کیا۔

برانڈی کی ایک بوتل خرید کر وہ لوٹ رہا تھا کہ گرین ہوٹل کے پاس آ کے رک گیا ہوٹل کے نیچے قد آدم شیشوں کا بنا ہوا قالینوں کا شوروم تھا یہ جمیل کے دوست

پیر صاحب کا تھا۔

اس نے سوچا چلو اندر چلیں چنانچہ چند لمحات کے بعد ہی وہ شوروم میں تھا اور اپنے دوست پیر سے جو عمر میں اس سے کافی بڑا تھا ہنسی مذاق کی گفتگو کر رہا تھا۔

برانڈی کی بوتل باریک کاغذ میں لپٹی دبیز ایرانی قالین پر لیٹی ہوئی تھی پیر صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جمیل سے کہا "یار اس دلہن کا گھونگھٹ تو کھولو۔۔۔۔ذرا اس سے چھیڑ خانی تو کرو۔"

جمیل مطلب سمجھ گیا "تو پیر صاحب گلاس اور سوڈے منگوائیے پھر دیکھئے کیا رنگ جمتا ہے۔"

فوراً گلاس اور یخ بستہ سوڈے آ گئے پہلا دور ہوا دوسرا دور شروع ہونے ہی والا تھا کہ پیر صاحب کے ایک گجراتی دوست اندر چلے آئے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پر بیٹھ گئے اتفاق سے ہوٹل کا چھوکرا دو کے بجائے تین گلاس اٹھا لایا تھا پیر صاحب کے گجراتی دوست نے بڑی صاف اردو میں چند ادھر ادھر کی باتیں کیں اور گلاس میں یہ بڑا پیگ ڈال کر اس کو سوڈے سے لبالب بھر دیا تین چار لمبے لمبے گھونٹ لے کر انہوں نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا "سگریٹ نکالو یار!"

پیر صاحب میں ساتوں عیب شرعی تھے، مگر وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے جمیل نے جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور قالین پر رکھ دیا ساتھ ہی لائٹر۔۔۔۔

اس پر پیر صاحب نے جمیل سے اس گجراتی کا تعارف کرایا "مسٹر نتور لال۔۔۔۔۔آپ مورتیوں کی دلالی کرتے ہیں"

جمیل نے ایک لحظے کے لیے سوچا، کوئلوں کی دلالی میں تو انسان کا منہ کالا ہوتا

ہے۔۔۔۔موتیوں کی دلالی میں۔۔۔۔

پیر صاحب نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''مسٹر جمیل۔۔۔۔مشہور سونگ رائٹر۔۔۔''

دونوں نے ہاتھ ملایا اور برانڈی کا نیا دور شروع ہوا اور ایسا شروع ہوا کہ بوتل خالی ہوگئی۔

جمیل نے دل میں سوچا یہ کم بخت موتیوں کا دلال بلا کا پینے والا ہے۔۔۔۔۔میری پیاس اور سرور کی ساری برانڈی چڑھا گیا خدا کرے اسے موتیا بند ہو۔۔۔۔

مگر جونہی آخری دور کے پیگ نے جمیل کے پیٹ میں اپنے قدم جمائے، اس نے نتو رلال کو معاف کر دیا آخر میں اس سے کہا ''مسٹر نتو ر، اٹھیے ایک بوتل اور ہو جائے''

نتو رفوراً اٹھا اپنے سفید ڈگلے کی شکنیں درست کیں دھوتی کی لانگ ٹھیک کی اور کہا ''چلیے!''

جمیل پیر صاحب سے مخاطب ہوا ''ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں''

جمیل اور نتو ر نے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور شراب کی دکان پر پہنچے جمیل نے ٹیکسی روکی مگر نتو ر نے کہا ''مسٹر جمیل۔۔۔۔۔۔یہ دکان ٹھیک نہیں۔۔۔۔ساری چیزیں مہنگی بیچتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا ''دیکھو کولابہ چلو!''

کولابہ پہنچ کر نتو ر، جمیل کو شراب کی ایک چھوٹی سی دکان میں لے گیا جو برانڈ جمیل نے فورٹ سے لیا، وہ تو نہ مل سکا ایک دوسرا مل گیا جس کی نتو ر نے بہت

تعریف کی کہ نمبرون چیز ہے۔

یہ نمبرون چیز خرید کر دونوں باہر نکلے۔۔۔۔ساتھ ہی بار تھی نور رک گیا ''مسٹر جمیل، کیا خیال ہے آپ کا ایک دو پیگ یہیں سے پی کر چلتے ہیں''

جمیل کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے کہ اس کا نشہ حالت نزع میں تھا چنانچہ دونوں بار کے اندر داخل ہوئے معاً جمیل کو خیال آیا کہ بار والے تو کبھی باہر کی شراب پینے کی اجازت نہیں دیا کرتے ''مسٹر نور آپ یہاں کیسے پی سکتے ہیں یہ لوگ اجازت نہیں دیں گے''

نور نے زور سے آنکھ ماری ''سب چلتا ہے''

اور یہ کہہ کر وہ ایک کیبن کے اندر گھس گیا جمیل بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔۔۔۔نور نے بوتل سنگین تپائی پر رکھی اور بیرے کو آواز دی۔۔۔۔جب وہ آیا تو اس کو بھی آنکھ ماری'' دیکھو اور سوڈے روجرز۔۔۔۔ٹھنڈے۔۔۔اور دو گلاس ایک دم صاف''

بیرا یہ حکم سن کر چلا گیا اور فوراً سوڈے اور گلاس حاضر کر دیئے، اس پر نور نے اسے دوسرا حکم دیا ''فسٹ کلاس چپس اور ٹومیٹوسوس اور فسٹ کلاس کٹلس!''

بیرا چلا گیا نور جمیل کی طرف دیکھ کر ایسے ہی مسکرایا بوتل کا کارک نکالا اور جمیل کے گلاس میں اس سے پوچھے بغیر ایک ڈبل ڈال دیا۔ خود اس سے کچھ زیادہ سوڈا حل ہو گیا تو دونوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔

جمیل پیاسا تھا ایک ہی جرعے میں اس نے آدھا گلاس ختم کر دیا سوڈا چونکہ بہت ٹھنڈا اور تیز تھا اس لیے پھوں پھوں کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد چپس اور کٹلس آ گئے۔۔۔۔۔جمیل صبح گھر سے ناشتہ کر کے نکلا تھا لیکن برانڈی نے اسے بھوک لگا دی چپس گرم گرم تھے، کٹلس بھی وہ پل پڑا۔۔۔۔نتو رنے اس کا ساتھ دیا چنانچہ دو منٹ میں دونوں پلیٹیں صاف!

دو پلیٹیں اور منگوائی گئیں جمیل نے اپنے لیے چوپس بھی منگوائے دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے بوتل کی تین چوتھائی غائب ہو چکی تھی جمیل نے سوچا کہ اب پیر صاحب کے پاس جانا بیکار ہے۔

نشے خوب جم رہے تھے سرور خوب گھٹ رہے تھے نتو راور جمیل دونوں ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے ایسے سواروں کو عام طور پر ایسی وادیوں میں جانے کی بڑی خواہش ہوتی ہے، جہاں انہیں عریاں بدن حسین عورتیں ملیں وہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر بٹھا لیں اور یہ جا وہ جا!

جمیل کا دل و دماغ اس وقت کسی ایسی ہی وادی کے متعلق سوچ رہا تھا جہاں اس کی کسی ایسی خوبصورت عورت سے مڈ بھیڑ ہو جائے جس کو وہ اپنے تپتے ہوئے سینے کے ساتھ بھینچ لے، اس زور سے کہ اس کی ہڈیاں تک چیخ جائیں۔

جمیل کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ ایسی جگہ پر ہے۔۔۔۔مطلب ہے ایسے علاقے میں ہے جو اپنے بروتھلز (قحبہ خانے) کی وجہ سے ساری بمبئی میں مشہور ہے جنہیں عیاشی کرنا ہوتی ہے وہ ادھر کا رخ کرتے ہیں شہر سے بھی جس لڑکی کو لک چھپ کر پیشہ کرنا ہوتا ہے یہیں آتی ہے ان معلومات کی بناء پر اس نے نتو رسے کہا ''میں نے کہا۔۔۔۔وہ۔۔۔۔وہ۔۔۔۔میرا مطلب ہے، ادھر کوئی چھوکری وو کری نہیں ملتی؟''

نور نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ انڈیلا اور ہنسا ''مسٹر جمیل! ایک نہیں، ہزاروں۔۔۔۔۔ ہزاروں۔۔۔۔۔۔ ہزاروں۔۔۔۔''

یہ ہزاروں کی گردان جاری رہتی اگر جمیل نے اس کی بات کاٹی نہ ہوتی ''ان ہزاروں میں سے آج ایک ہی مل جائے تو ہم سمجھیں کہ نور بھائی نے کمال کر دیا۔''

نور بھائی مزے میں تھے جھوم کر کہا'' جمیل بھائی۔۔۔ایک نہیں ہزاروں۔۔۔۔چلو اس کو ختم کرو''

دونوں نے بوتل میں جو کچھ بچا تھا آدھے گھنٹے کے اندر اندر ختم کر دیا بل ادا کرنے اور بیرے کو تگڑی ٹپ دینے کے بعد دونوں باہر نکلے، اندر اندھیرا تھا، باہر دھوپ چمک رہی تھی جمیل کی آنکھیں چندھیا گئیں ایک لمحے کے لیے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں تیز روشنی کی عادی ہوئیں تو اس نے نور سے کہا'' چلو بھئی!''

نور نے تلاشی لینے والی نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا'' مال پانی ہے نا؟''

جمیل کے ہونٹوں پر نشیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی نور کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دے کر اس نے کہا'' بہت۔۔۔۔نور بھائی، بہت'' اور اس نے جیب سے پانچ نوٹ سو سو کے نکالے'' کیا اتنے کافی نہیں؟''

نور کی باچھیں کھل گئیں'' کافی۔۔۔؟ بہت زیادہ ہیں۔۔۔۔چلو آؤ، پہلے ایک بوتل خرید لیں، وہاں ضرورت پڑے گی۔''

جمیل نے سوچا، بات بالکل ٹھیک ہے وہاں ضرورت نہیں پڑے گی تو کیا کسی مسجد میں پڑے گی چنانچہ فوراً ایک بوتل خرید لی گئی ٹیکسی کھڑی تھی دونوں اس میں

بیٹھ گئے اور اس وادی کی سیاحی کرنے لگے۔

سینکڑوں بروتھلز تھے ان میں سے بیس پچیس کا جائزہ لیا گیا، مگر جمیل کو کوئی عورت پسند نہ آئی سب میک اپ کی موٹی اور شوخ تہوں کے اندر چھپی ہوئی تھیں جمیل چاہتا تھا کہ ایسی لڑکی ملے جو مرمت شدہ مکان معلوم نہ ہو جس کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہو کہ جگہ جگہ اکھڑے ہوئے پلستر کے ٹکڑوں پر بڑے اناڑی پن سے سرخی اور چونہ لگایا گیا ہے۔

نور رنگ آ گیا اس کے سامنے جو بھی عورت آتی تھی، وہ جمیل کا کندھا پکڑ کر کہتا "جمیل بھائی، چلے گی!"

مگر جمیل بھائی اٹھ کھڑا ہوتا "ہاں چلے گی۔۔۔۔۔۔اور ہم بھی چلیں گے!"

دو جگہیں اور دیکھی گئیں مگر جمیل کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا وہ سوچتا تھا کہ ان عورتوں کے پاس کون آتا ہے، جو سور کے سوکھے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں ان کی ادائیں کتنی مکروہ ہیں اٹھنے بیٹھنے کا اندازہ کتنا فحش ہے اور کہنے کو یہ پرائیویٹ ہیں، یعنی ایسی عورتیں جو در پردہ پیشہ کراتی ہیں۔۔۔۔جمیل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پردہ ہے کہاں جس کے پیچھے یہ دھندا کرتی ہیں۔

جمیل سوچ ہی رہا تھا کہ اب پروگرام کیا ہونا چاہیے کہ نور نے ٹیکسی رکوائی اور اتر کر چلا گیا کہ ایک دم اسے ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔

اب جمیل اکیلا تھا ٹیکسی تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی اس وقت ساڑھے چار بج چکے تھے۔۔۔۔اس نے ڈرائیور سے پوچھا "یہاں کوئی بھڑوا ملے گا؟"

ڈرائیور نے جواب دیا ''ملے گا جناب!''

''تو چلو اس کے پاس!''

ڈرائیور نے دو تین موڑ گھومے اور ایک پہاڑی بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی دو تین مرتبہ ہارن بجایا۔

جمیل کا سر نشے کے باعث سخت بوجھل ہو رہا تھا آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی ہوئی تھی۔۔۔ اسے معلوم نہیں کیسے اور کس طرح، مگر جب اس نے ذرا دماغ کو جھٹکا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک پلنگ پر بیٹھا ہے اور اس کے پاس ہی ایک جوان لڑکی جس کی ناک کی پھننگ پر چھوٹی سی پھنسی تھی، اپنے بریدہ بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔

جمیل نے اس کو غور سے دیکھا سوچنے ہی والا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا مگر اس کے شعور نے اس کو مشورہ دیا کہ دیکھو یہ سب عبث ہے جمیل نے سوچا، یہ ٹھیک ہے لیکن پھر بھی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر نوٹ گن کر اور پاس پڑی ہوئی تپائی پر برانڈی کی سالم بوتل دیکھ کر اپنی تشفی کر لی کہ سب خیریت ہے اس کا نشہ کسی قدر نیچے اتر گیا۔

اٹھ کر وہ اس گیسو بریدہ لڑکی کے پاس گیا اور، اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا مسکرا کر اس سے کہا ''کہیے مزاج کیسا ہے؟''

اس لڑکی نے کنگھی میز پر رکھی اور کہا ''کہیے، آپ کا کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہوں!'' یہ کہہ کر اس نے اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔۔۔ ''آپ کا نام؟''

''بتاتو چکی ایک دفعہ۔۔۔۔آپ کو میرا خیال ہے یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ آپ ٹیکسی میں یہاں آئے۔۔جانے کہاں کہاں گھومتے رہتے ہوں گے کہ بل اڑتیس روپے بنا جو آپ نے ادا کیا اور ایک شخص جس کا نام شاید نتو رتھا، آپ نے اس کو بے شمار گالیاں دیں۔''

جمیل اپنے اندر ڈوب کر سارے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے ہی والا تھا کہ اس نے سوچا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں، میں بھول جایا کرتا ہوں۔۔۔۔یا یوں سمجھئے کہ مجھے بار بار پوچھنے میں مزہ آتا ہے۔۔۔۔وہ صرف اتنا یاد کر سکا کہ اس نے ٹیکسی والے کا بل جو کہ اڑتیس روپے بنتا تھا ادا کیا تھا۔

لڑکی بلنگ پر بیٹھ گئی ''میرا نام تارہ ہے!''

جمیل نے اس کو لٹا دیا اور اس سے مصنوعی قسم کا پیار کرنے لگا

تھوڑی دیر کے بعد اس کو پیاس محسوس کی تو اس نے تارہ سے کہا ''دو یخ بستہ سوڈے اور گلاس۔''

تارہ نے یہ دونوں چیزیں فوراً حاضر کر دیں جمیل نے بوتل کھولی اپنے لیے ایک پیگ ڈال کر اس نے دوسرا تارہ کے لیے ڈالا۔۔۔۔۔۔۔پھر دونوں پینے لگے۔

تین پیگ پینے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ اس کی حالت بہتر ہوگئی ہے تارہ کو چومنے چاٹنے کے بعد اس نے سوچا کہ اب قصہ مختصر ہو جانا چاہیے ''کپڑے اتار دو!''

''سارے؟''

"ہاں سارے!"

تارہ نے کپڑے اتار دیئے اور لیٹ گئی جمیل نے اس کے ننگے جسم کو ایک نظر دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ اچھا ہیاس کے ساتھ ہی خیالات کا ایک تانتا بندھ گیا جمیل کا نکاح ہو چکا تھا اس نے اپنی بیوی کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔

اس کا بدن کیسا ہوگا۔۔۔۔کیا وہ تارہ کی طرح اس کے ایک مرتبہ کہنے پر اپنے سارے کپڑے اتار کر اس کے ساتھ لیٹ جائے گی؟

کیا وہ اس کے ساتھ برانڈی پیئے گی؟

کیا اس کے بال کٹے ہوئے ہیں؟

پھر فوراً اس کا ضمیر جاگا جس نے اس کو لعنت ملامت شروع کر دی نکاح کا یہ مطلب تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی صرف ایک مرحلہ باقی تھا، کہ وہ اپنی سسرال جائے اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئے۔۔۔۔۔کیا اس کے لیے یہ واجب تھا کہ ایک بازاری عورت کو اپنے آغوش کی زینت بنائے۔۔۔۔خم کے خم لنڈھاتا پھرے۔

جمیل بتہ خفیف ہوا اور اسی خفت میں اس کی آنکھیں مندنا شروع ہو گئیں اور وہ سو گیا تارہ بھی تھوڑی دیر کے بعد خواب غفلت کے مزے لینے لگی۔

جمیل نے کئی بے ربط، اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔۔۔۔کوئی دو گھنٹے کے بعد جب کہ ایک بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا وہ ہڑبڑا کے اٹھا جب اچھی طرح آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک اجنبی کمرے میں ہے اور اس کے ساتھ ایک الف ننگی لڑکی لیٹی ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد واقعات آہستہ آہستہ اس کے

دماغ کی دھند چیر کر نمودار ہونے لگے۔

وہ خود بھی الف ننگا تھا بوکھلاہٹ میں اس نے الٹا پائجامہ پہن لیا، مگر اس کو اس کا احساس نہ ہوا، کرتہ پہن کر اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں نوٹ سب کے سب موجود تھے اس نے سوڈا کھولا اور ایک پیگ بنا کر پیا پھر اس نے تارہ کو ہولے سے جھنجھوڑا ''اٹھو!''

تارہ آنکھیں ملتی اٹھی جمیل نے اس سے کہا ''کپڑے پہن لو!''

تارہ نے کپڑے پہن لیے۔۔۔۔۔باہر گہری شام رات بننے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ جمیل نے سوچا اب کوچ کرنا چاہیے لیکن وہ تارہ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا، کیونکہ بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل گئی تھیں'' کیوں تارہ جب ہم لیٹے۔۔۔۔میرا مطلب ہے جب میں نے تم سے کپڑے اتارنے کو کہا تو اس کے بعد کیا ہوا؟''

تارہ نے جواب دیا'' کچھ نہیں۔۔۔۔۔آپ نے اپنے کپڑے اتارے اور میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے سو گئے''

''بس؟''

''ہاں۔۔۔۔لیکن سونے سے پہلے آپ دو تین مرتبہ بڑبڑائے اور کہا'' میں گنہگار ہوں۔۔۔۔میں گنہگار ہوں۔'' یہ کہہ کر تارہ اٹھی اور اپنے بال سنوارنے لگی''

جمیل بھی اٹھا گناہ کا احساس دبانے کے لیے اس نے ڈبل پیگ اپنے حلق میں جلدی جلدی انڈیلا بوتل کو کاغذ میں لپیٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

تارہ نے پوچھا'' چلے؟''

''ہاں، پھر کبھی آؤں گا'' یہ کہہ کر وہ لوہے کی پیچ دار سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا بڑے بازار کی طرف اس کے قدم اٹھنے ہی والے تھے کہ ہارن بجا اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ٹیکسی کھڑی تھی اس نے کہا چلو اچھا ہوا، یہیں مل گئی پیدل چلنے کی زحمت سے بچ گئے۔

اس نے ڈرائیور سے پوچھا ''کیوں بھائی خالی ہے؟''

ڈرائیور نے جواب دیا ''خالی ہے کا کیا مطلب۔۔۔۔۔لگی ہوئی ہے!''

''تو پھر۔۔۔'' یہ کہہ کر جمیل مڑا لیکن ڈرائیور نے اس کو پکارا ''کدھر جاتا ہے سیٹھ؟''

جمیل نے جواب دیا ''کوئی اور ٹیکسی دیکھتا ہوں''

ڈرائیور باہر نکل آیا ''مستک تو نہیں پھرے لا۔۔۔۔۔۔یہ ٹیکسی تمہیں نے تو لے رکھی ہے!''

جمیل بوکھلا گیا ''میں نے؟''

ڈرائیور نے بڑے گنوار لہجے میں اس سے کہا ''ہاں تو نے۔۔۔۔۔۔سالا دارو پی کر سب کچھ بھول گیا۔''

اس پر تو تو میں میں شروع ہوئی ادھر ادھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے جمیل نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا ''چلو!''

ڈرائیور نے ٹیکسی چلائی ''کدھر؟''

جمیل نے کہا ''پولیس اسٹیشن!''

ڈرائیور نے اس پر جانے کیا واہی تباہی بکی۔۔۔۔جمیل سوچ میں پڑ گیا جو

ٹیکسی اس نے لی تھی اس کا بل جو کہ اڑتیس روپے کا تھا اس نے ادا کر دیا تھا اب یہ نئی ٹیکسی کہاں سے آن ٹپکی گو وہ نشے کی حالت میں تھا مگر وہ یقینی طور پر کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ٹیکسی نہیں تھی اور نہ یہ ڈرائیور وہ ڈرائیور، جو اسے یہاں لایا تھا۔

پولیس اسٹیشن پہنچے جمیل کے قدم بہت بری طرح لڑکھڑا رہے تھے سب انسپکٹر جو کہ اس وقت ڈیوٹی پر تھا فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے، اس نے جمیل کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا

ڈرائیور نے اپنی داستان شروع کر دی جو سرتاپا غلط تھی جمیل یقیناً اس کی تردید کرتا مگر اس میں زیادہ بولنے کی ہمت نہیں تھی سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا ''جناب! میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ کیا قصہ ہے جو ٹیکسی میں نے لی تھی، اس کا کرایہ میں نے اڑتیس روپے ادا کر دیا تھا اب معلوم نہیں یہ کون ہے اور مجھ سے کیسا کرایہ مانگتا ہے۔''

ڈرائیور نے کہا، ''حضور انسپکٹر بہادر، یہ دارو پیے ہے'' اور ثبوت کے طور پر اس نے جمیل کی برانڈی کی بوتل میز پر رکھ دی۔

جھنجھلا گیا ''ارے بھئی کون سور کہتا ہے کہ اس نے نہیں پی۔۔۔۔۔۔ سوال تو یہ ہے کہ آپ کہاں سے تشریف لے آئے؟''

سب انسپکٹر شریف آدمی تھا کرایہ ڈرائیور کے حساب سے بیالیس روپے بنتا تھا اس نے پندرہ روپے میں فیصلہ کر دیا ڈرائیور بہت چیخا چلایا مگر سب انسپکٹر نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر تھانے سے نکلوا دیا پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ دوسری ٹیکسی بلائے ٹیکسی آئی تو اس نے ایک سپاہی جمیل کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے گھر

چھوڑ آئے جمیل نے لکنت بھرے لہجے میں اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پوچھا "جناب کیا یہ گرانٹ روڈ پولیس اسٹیشن ہے؟"

سب انسپکٹر نے زور کا قہقہہ لگایا اور پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مسٹر، اب ثابت ہو گیا کہ تم نے خوب پی رکھی ہے۔۔۔۔ یہ کولابہ پولیس اسٹیشن ہے۔۔۔۔ جاؤ اب گھر جا کر سو جاؤ۔"

جمیل گھر جا کے کھانا کھائے اور کپڑے اتارے بغیر سو گیا۔۔۔۔ برانڈی کی بوتل بھی اس کے ساتھ سوئی رہی۔

دوسرے روز وہ دس بجے کے قریب اٹھا جوڑ جوڑ میں درد تھا سر میں جیسے بڑے بڑے وزنی پتھر تھے منہ کا ذائقہ خراب اس نے اٹھ کا دو تین گلاس فروٹ سالٹ کے پیے، چار پانچ پیالے چائے کے کہیں شام کو جا کر طبیعت کسی قدر بحال ہوئی اور اس نے خود کو گزشتہ واقعات کے متعلق سوچنے کے قابل محسوس کیا۔

بہت لمبی زنجیر تھی ان میں سے بعض کڑیاں تو سلامت تھیں، مگر بعض غائب واقعات کا تسلسل شروع سے لے کر گرین ہوٹل اور وہاں سے کولابہ تک بالکل صاف تھا۔ اس کے بعد جب نور کے ساتھ خاص وادی کی سیاحی شروع ہوئی تھی معاملہ گڈمڈ ہو جاتا تھا چند جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں، بڑی واضح، مگر فوراً مبہم پر چھائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

وہ کیسے اس لڑکی کے گھر پہنچا۔۔۔۔ اس کا نام جمیل کے حافظے سے پھسل کر جانے کس کھڈ میں جا گرا تھا۔۔۔۔ اس کی شکل و صورت اسے البتہ بڑی اچھی طرح یاد تھی۔

وہ اس کے گھر کیسے پہنچا تھا؟۔۔۔۔۔۔یہ جاننا بہت اہم تھا اگر جمیل کا حافظہ اس کی مدد کرتا تو بہت سی چیزیں صاف ہو جاتیں مگر بصد کوشش وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

اور یہ ٹیکسیوں کا کیا سلسلہ تھا اس نے پہلی کو تو چھوڑ دیا تھا، مگر دوسری کہاں سے ٹپک پڑی تھی؟

سوچ سوچ کے جمیل کا دماغ پاش پاش ہو گیا اس نے محسوس کیا کہ جتنے وزنی پتھر اس میں پڑے تھے، سب آپس میں ٹکرا ٹکرا کر چور چور ہو گئے ہیں۔

رات کو اس نے برانڈی کے تین پیگ پیے، تھوڑا سا ہلکا کھانا کھایا اور گزشتہ واقعات کے متعلق سوچتا سوچتا سو گیا۔

وہ ٹکڑے جو گم ہو گئے تھے ان کو تلاش کرنا اب جمیل کا شغل ہو گیا تھا وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس روز ہوا من وعن اس کی آنکھوں کے سامنے آ جائے اور یہ روز روز کی مغز پاشی دور ہو۔۔۔۔۔اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ اس کا گناہ نامکمل رہ گیا وہ سوچتا تھا، یہ ادھورا گناہ جائے گا کس کھاتے میں وہ چاہتا تھا کہ بس ایک دفعہ اس کی بھی تکمیل ہو جائے۔

مگر تلاش بسیار کے باوجود وہ پہاڑی بنگلوں جیسا مکان جمیل کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے ایک دن سوچا، کیا یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا۔

مگر خواب کیسے ہو سکتا تھا خواب میں آدمی اتنے روپے تو خرچ نہیں کرتا۔۔۔اس روز اس کے کم از کم ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے تھے۔

پیر صاحب سے اس نے نور کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس روز کے بعد دوسرے دن ہی سمندر پار کہیں چلا گیا ہے غالباً موتیوں کے سلسلے میں جمیل نے اس پر ہزار لعنتیں بھیجیں اور اپنی تلاش شروع کر دی۔

اس نے جب اپنے حافظے پر بتہ زور دیا تو بنگلے کی دیوار کے ساتھ پیتل کی ایک پلیٹ نظر آئی۔۔۔۔اس پر کچھ لکھا تھا۔۔۔۔غالباً۔۔۔ڈاکٹر۔۔۔ڈاکٹر بیرام جی۔۔۔۔آگے جانے کیا۔۔۔۔۔

ایک دن کولابہ کی گلیوں میں چلتے چلتے آخر وہ ایک ایسی گلی میں پہنچا جو اس کو جانی پہچانی معلوم ہوئی۔۔۔۔دو رویہ اسی قسم کی بنگلہ نما عمارتیں تھیں ہر عمارت کے باہر چھوٹے چھوٹے پیتل کے بورڈ لگے تھے۔کسی پر چار، کسی پر پانچ۔۔۔۔کسی پر تین۔

وہ ادھر ادھر غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا، مگر اس کے دماغ میں وہ خط گھوم رہا تھا جو صبح اس کی ساس کی طرف سے موصول ہوا تھا کہ اب انتظار کی حد ہو گئی ہے میں نے تاریخ مقرر کر دی ہے، آؤ اور اپنی دلہن کو لے جاؤ۔

اور وہ ادھر ایک نامکمل گناہ کو مکمل بنانے کی کوشش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔جمیل نے کہا، ہٹاؤ جی اس وقت۔۔۔۔۔پھر نے دو مارا مارا۔۔۔۔ایک دم اس نے اپنے داہنے ہاتھ پیتل کا ایک چھوٹا سا بورڈ دیکھا۔۔۔۔اس پر لکھا تھا۔۔۔ڈاکٹر ایم بیرام جی۔۔۔ایم ڈی۔

جمیل کانپنے لگا یہ وہی بلڈنگ۔۔۔۔۔بالکل وہی۔۔۔۔۔وہی رنگ، وہی بل کھاتی ہوئی آہنی سیڑھیاں جمیل بے دھڑک اوپر چلا گیا اس کے لیے اب ہر چیز

جانی پہچانی تھی کوری ڈور سے نکل کر اس نے سامنے والے دروازے پر دستک دی۔

ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔۔۔۔۔۔اسی لڑکے نے جو اس روز سوڈا اور برف لایا تھا۔جمیل نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اس سے پوچھا ''بیٹا، بائی جی ہیں؟''

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا ''جی ہاں!''

''جاؤ، ان سے کہو، صاحب ملنے آئے ہیں'' جمیل کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

لڑکا دروازہ بھیڑ کر اندر چلا گیا

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور تارہ نمودار ہوئی اس کو دیکھتے ہی جمیل نے پہچان لیا کہ وہی لڑکی ہے، مگر اب اس کی ناک پر پھنسی نہیں تھی ''نمستے!''

''نمستے، کہیے مزاج کیسے ہیں؟'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

جمیل نے جواب دیا ''اچھے ہیں۔۔۔۔میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا، اس لیے آ نہ سکا۔۔۔۔۔کہو، پھر کیا ارادہ ہے؟''

تارہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''معاف کیجئے، میری شادی ہو چکی ہے''

جمیل بوکھلا گیا ''شادی؟۔۔۔۔۔۔۔کب؟''

تارہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا ''جی، آج صبح۔۔۔۔۔آیئے میں آپ کو اپنے پتی سے ملاؤں۔''

جمیل چکرا گیا اور کچھ کہے سنے بغیر کھٹا کھٹ نیچے اتر گیا۔۔۔۔ سامنے ٹیکسی کھڑی تھی۔۔۔۔ جمیل کا دل ایک لحظے کے لیے ساکت سا ہو گیا تیز قدم اٹھاتا وہ بڑے بازار کی طرف نکل گیا۔

معاً جمیل کو جاتے دیکھ کر ڈرائیور نے زور سے کہا "سیٹھ صاحب ٹیکسی!"

جمیل نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔۔۔۔۔ "نہیں کمبخت، شادی!"

☆☆☆☆☆

شانتی

دونوں پیرے ژین ڈیری کے باہر بڑے دھاریوں والے چھاتے کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ادھر سمندر تھا جس کی لہروں کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ چائے بہت گرم تھی اس لیے دونوں آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہے تھے سامنے موٹی بھوؤں والی یہودن کی جانی پہچانی صورت تھی۔ یہ بڑا گول مٹول چہرہ تیکھی ناک موٹے موٹے بہت ہی زیادہ سرخی لگے ہونٹ شام کو ہمیشہ درمیان والے دروازے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی مقبول نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بلراج سے کہا ''بیٹھی ہے جال پھینکیے''

بلراج موٹی بھوؤں کی طرف دیکھے بغیر بولا'' پھنس جائے گی کوئی نہ کوئی مچھلی''

مقبول نے ایک پیسٹری منہ میں ڈالی'' یہ کاروبار بھی عجیب کاروبار ہے کوئی دکان کھول کر بیٹھتی ہے کوئی چل پھر کے سودا بیچتی ہے۔ کوئی اس طرح ریستورانوں میں گاہک کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔۔۔ جسم بیچنا بھی ایک آرٹ ہے اور میرا خیال ہے بہت مشکل آرٹ ہے۔۔۔۔ یہ موٹی بھوؤں والی کیسے گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کیسے کسی مرد کو یہ بتاتی ہوگی کہ وہ بکاؤ ہے۔''

بلراج مسکرایا'' کسی روز وقت نکال کر کچھ دیر یہاں بیٹھو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ نگاہوں ہی نگاہوں میں کیونکر سودے ہوتے ہیں اس جنس کا بھاؤ کیسے چلتا ہے''

یہ کہہ کر اس نے ایک دم مقبول کا ہاتھ پکڑا'' ادھر دیکھو، ادھر''

مقبول نے موٹی یہودن کی طرف دیکھا بلراج نے اس کا ہاتھ دبایا ''نہیں یار۔۔۔۔ادھر کونے کے چھاتے کے نیچے دیکھو''

مقبول نے ادھر دیکھا ایک دبلی پتلی، گوری چٹی لڑکی کرسی پر بیٹھ رہی تھی بال کٹے ہوئے تھے ناک نقشہ ٹھیک تھا ہلکے زرد رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی مقبول نے بلراج سے پوچھا ''کون ہے یہ لڑکی؟''

بلراج نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ''اماں وہی ہے جس کے بارے میں تم سے کہا تھا کہ بڑی عجیب وغریب ہے۔''

مقبول نے کچھ دیر سوچا پھر کہا ''کون سی یار تم تو جس لڑکی سے بھی ملتے ہو عجیب وغریب ہی ہوتی ہے۔''

بلراج مسکرایا ''یہ بڑی خاص الخاص ہے۔۔۔۔ذرا غور سے دیکھو''

مقبول نے غور سے دیکھا بریدہ بالوں کا رنگ بھوسلا تھا ہلکے بسنتی رنگ کی ساڑھی کے نیچے چھوٹی آستینوں والا بلاؤز پتلی پتلی بہت ہی گوری بانہیں لڑکی نے اپنی گردن موڑی تو مقبول نے دیکھا کہ اس کے باریک ہونٹوں پر سرخی پھیلی ہوئی سی تھی ''میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر تمہاری اس عجیب وغریب لڑکی کو سرخی استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔۔۔۔اب اور غور سے دیکھا ہے تو ساڑھی کی پہناوٹ میں بھی خامیاں نظر آئی ہیں۔بال سنوارنے کا انداز بھی ستھرا نہیں۔''

بلراج ہنسا ''تم صرف خامیاں ہی دیکھتے ہو اچھائیوں پر تمہاری نگاہ کبھی نہیں پڑتی۔''

مقبول نے کہا ''جو اچھائیاں ہیں وہ اب بیان فرما دیجئے لیکن پہلے یہ بتا دیجئے

کہ آپ اس لڑکی کو ذاتی ور پر جانتے ہیں یا۔۔۔۔"

لڑکی نے جب بلراج کو دیکھا تو مسکرائی مقبول رک گیا" مجھے جواب مل گیا اب آپ محترمہ کی خوبیاں بتا دیجئے"

"سب سے پہلی خوبی اس لڑکی میں یہ ہے کہ بہت صاف گو ہے کبھی جھوٹ نہیں بولتی جو اصول اس نے اپنے لیے بنا رکھے ہیں ان پر بڑی پابندی سے عمل کرتی ہے پرسنل ہائی جین کا بہت خیال رکھتی ہے محبت وحبت کی بالکل قائل نہیں اس معاملے میں دل اس کا برف ہے۔"

بلراج نے چائے کا آخری گھونٹ پیا" کہیے کیا خیال ہے؟"

مقبول نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا" جو خوبیاں تم نے بتائی ہیں ایک ایسی عورت میں نہیں ہونی چاہئیں جس کے پاس مرد صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ ان سے اصلی نہیں تو مصنوعی محبت ضرور کرے گی۔۔۔۔۔خود فریبی میں اگر یہ لڑکی کسی مرد کی مدد نہیں کرتی تو میں سمجھتا ہوں بڑی بے وقوف ہے۔"

"یہی میں نے سوچا تھا۔۔۔۔میں تم سے کیا بیان کروں، روکھے پن کی حد تک صاف گو ہے اس سے باتیں کرو تو کئی بار دھکے سے لگتے ہیں۔۔۔۔ایک گھنٹہ ہو گیا تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی۔۔۔۔۔میں چلی اور یہ جا وہ جا۔۔۔تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے، جاؤ چلے جاؤ۔۔۔۔ساڑھی کو ہاتھ مت لگاؤ میلی ہو جائے گی" یہ کہہ کر بلراج نے سگریٹ سلگایا" عجیب وغریب لڑکی ہے پہلی دفعہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں بائی گوڈ چکرا گیا چھوٹے ہی مجھ سے کہا ففٹی سے ایک پیسہ کم نہیں ہوگا جیب میں ہیں تو چلو ورنہ مجھے اور کام ہیں۔"

مقبول نے پوچھا ''نام کیا ہے اس کا''

''شانتی بتایا اس نے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کشمیرن ہے''

مقبول کشمیری تھا چونک پڑا ''کشمیرن''

''تمہاری ہم وطن''

مقبول نے لڑکی کی طرف دیکھا ناک نقشہ صاف کشمیریوں کا تھا ''یہاں کیسے آئی؟''

''معلوم نہیں''

''کوئی رشتے دار ہے اس کا؟'' مقبول لڑکی میں دلچسپی لینے لگا

''وہاں کشمیر میں کوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا یہاں بمبئی میں اکیلی رہتی ہے''

بلراج نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا ''ہاربی روڈ پر ایک ہوٹ ہے، وہاں اس نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔۔۔ یہ مجھے ایک روز اتفاقاً معلوم ہو گیا ورنہ یہ اپنے ٹھکانے کا پتہ کسی کو نہیں دیتی جس کو ملنا ہوتا ہے یہاں پیرے ژین وڈیری میں چلا آتا ہے شام کو پورے پانچ بجے آتی ہے یہاں''

مقبول کچھ دیر خاموش رہا پھر بیرے کو اشارے سے بلایا اور اس سے بلانے کے لیے کہا اس دوران میں ایک خوش پوش نوجوان آیا اور اس لڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا دونوں باتیں کرنے لگے مقبول بلراج سے مخاطب ہوا ''اس سے کبھی ملاقات کرنی چاہیے۔''

بلراج مسکرایا ''ضرور ضرور۔۔۔ لیکن اس وقت نہیں مصروف ہے کبھی آ جانا یہاں شام کو۔۔۔۔۔ اور ساتھ بیٹھ جانا''

مقبول نے بل ادا کیا دونوں دوست اٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے روز مقبول اکیلا آیا اور چائے کا آرڈر دے کر بیٹھ گیا ٹھیک پانچ بجے وہ لڑکی بس سے اتری اور پرس ہاتھ میں لٹکائے مقبول کے پاس سے گزری چال بھدی تھی جب وہ کچھ دور کرسی پر بیٹھ گئی تو مقبول نے سوچا ''اس میں جنسی کشش تو نام کو بھی نہیں حیرت ہے کہ اس کا کاروبار کیونکر چلتا ہے۔۔۔۔۔لپ اسٹک کیسے بے ہودہ طریقے سے استعمال کی ہے اس نے۔۔۔۔ساڑھی کی پہناوٹ آج بھی خامیوں سے بھری ہے۔''

پھر اس نے سوچا کہ اس سے کیسے ملے اس کی چائے میز پر آچکی تھی ورنہ اٹھ کر وہ اس لڑکی کے پاس جا بیٹھتا اس نے چائے پینا شروع کر دی اس دوران اس نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا لڑکی نے دیکھا کچھ توقف کے بعد اٹھی اور مقبول کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی مقبول پہلے تو کچھ گھبرایا لیکن فوراً ہی سنبھل کر لڑکی سے مخاطب ہوا ''چائے شوق فرمائیں گی آپ''

''نہیں''

اس کے جوابوں کے اس اختصار میں روکھا پن تھا۔ مقبول نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا ''کشمیریوں کو تو چائے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔''

لڑکی نے بڑے بے ہنگم انداز میں پوچھا ''تم چلنا چاہتے ہو میرے ساتھ''

مقبول کو جیسے کسی نے اوندھے منہ گرا دیا گھبراہٹ میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا ''ہا۔۔۔۔''

لڑکی نے کہا ''ففٹی روپیز۔۔۔۔یس اور نو؟''

یہ دوسرا ریلا تھا مگر مقبول نے اپنے قدم جما لیے "چلیے"

مقبول نے چائے کا بل ادا کیا دونوں اٹھ کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے راستے میں اس نے کوئی بات نہ کی لڑکی بھی خاموش رہی ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے مقبول سے پوچھا "کہاں جائے گا تم؟"

مقبول نے جواب دیا "جہاں تم لے جاؤ گی"

"ہم کچھ نہیں جانتا۔۔۔۔۔تم بولو کدھر جائے گا"

مقبول کو کوئی اور جواب نہ سوجھا تو کہا "ہم کچھ نہیں جانتا"

لڑکی نے ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا "تم کیسا آدمی ہے۔۔۔۔خالی پیلی جوک کرتا ہے۔"

مقبول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "میں مذاق نہیں کرتا۔۔۔۔مجھے تم سے صرف باتیں کرنی ہیں۔"

وہ بگڑ کر بولی "کیا۔۔۔۔۔۔۔تم تو بولا تھا ففٹی روپیز لیں"

مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے "یہ لو گھبراتی کیوں ہو"

اس نے نوٹ لے لیے "تم جائے گا کہاں؟"

مقبول نے کہا "تمہارے گھر"

"نہیں"

"کیوں نہیں"

"تم کو بولا ہے نہیں۔۔۔۔ادھر ایسی بات نہیں ہوگی"

مقبول مسکرایا ''ٹھیک ہے ایسی بات ادھر نہیں ہوگی''

کچھ متحیر سی ہوئی ''تم کیسا آدمی ہے''

''جیسا میں ہوں تم نے بولا ففٹی روپیز لیں کہ نو۔۔۔۔۔۔۔میں نے کہا لیں اور نوٹ تمہارے حوالے کر دیئے تم نے بولا ادھر ایسی بات نہیں ہوگی میں نے کہا بالکل نہیں ہوگی۔۔۔اب اور کیا چاہتی ہو''

لڑکی سوچنے لگی مقبول مسکرایا'' دیکھو شانتی بات یہ ہے کل تم کو دیکھا ایک دوست نے تمہاری کچھ باتیں سنائیں جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئیں آج میں نے تمہیں پکڑ لیا اب تمہارے گھر چلتے ہیں وہاں کچھ دیر تم سے باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔کیا تمہیں یہ منظور نہیں۔''

''نہیں۔۔۔۔یہ لو اپنے ففٹی روپیز۔۔۔۔''لڑکی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔

''تمہیں بس ففٹی روپیز کی پڑی ہے۔۔۔۔۔۔۔روپے کے علاوہ بھی دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں۔۔۔۔چلو، ڈرائیور کو اپنا ایڈریس بتاؤ۔۔۔۔میں شریف آدمی ہوں تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا'' مقبول کے انداز گفتگو میں صداقت تھی لڑکی متاثر ہوئی اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا ''چلو۔۔۔۔۔ڈرائیور، بار بنی روڈ''

ٹیکسی چلی تو اس نے نوٹ مقبول کی جیب میں ڈال دیئے ''یہ میں نہیں لوں گی''

مقبول نے اصرار نہ کیا ''تمہاری مرضی''

ٹیکسی ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے پاس رکی پہلی اور دوسری منزل پر مساس خانے تھے تیسری، چوتھی اور پانچویں منزل ہوٹل کے لیے مخصوص تھی بڑی تنگ و تار جگہ تھی چوتھی منزل پر سیڑھیوں کے سامنے والا کمرہ شانتی کا تھا۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا بہت مختصر سامان تھا لوہے کا ایک پلنگ جس پر اجلی چادر بچھی تھی کونے میں ڈریسنگ ٹیبل ایک سٹول اس پر ٹیبل فین چادر ٹرنک تھے وہ پلنگ کے نیچے دھرے تھے۔

مقبول کمرے کی صفائی سے بہت متاثر ہوا ہر چیز صاف ستھری تھی تکیے کے غلاف عام طور پر میلے ہوتے ہیں مگر اس کے دونوں تکیے بے داغ غلافوں میں ملفوف تھے مقبول پلنگ پر بیٹھنے لگا تو شانتی نے اسے روکا ''نہیں۔۔۔۔۔ادھر بیٹھنے کا اجازت نہیں۔۔۔۔ہم کسی کو اپنے بستر پر نہیں بیٹھنے دیتا کرسی پر بیٹھو'' یہ کہہ کر وہ خود پلنگ پر بیٹھ گئی مقبول مسکرا کر کرسی پر ٹک گیا۔

شانتی نے اپنا پرس تکیے کے نیچے رکھا اور مقبول سے پوچھا ''بولو۔۔۔۔۔کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟''

مقبول نے شانتی کی طرف غور سے دیکھا ''پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانی بالکل نہیں آتی''

شانتی نے برا نہ مانا صرف اتنا کہا ''مجھے مالوم ہے''

''اٹھو۔۔۔۔۔۔مجھے لپ اسٹک دو میں تمہیں سکھاتا ہوں'' یہ کہہ کر مقبول نے اپنا رومال نکالا۔

شانتی نے اس سے کہا ''ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہے، اٹھالو''

مقبول نے لپ اسٹک اٹھائی اسے کھول کر دیکھا" ادھر آؤ، میں تمہارے ہونٹ پونچھوں"

"تمہارے رومال سے نہیں۔۔۔۔۔میرا لو" یہ کہہ کر اس نے ٹرنک کھولا اور ایک دھلا ہوا رومال مقبول کو دیا مقبول نے اس کے ہونٹ پونچھے بڑی نفاست سے نئی سرخی ان پر لگائی پھر کنگھی سے اس کے بال ٹھیک کیے اور کہا" لو اب آئینہ دیکھو"

شانتی اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوگئی بڑے غور سے اس نے اپنے ہونٹوں اور بالوں کا معائنہ کیا پسندیدہ نظروں میں تبدیلی محسوس کی اور پلٹ کر مقبول سے صرف اتنا کہا" اب ٹھیک ہے" پھر پلنگ پر بیٹھ کر پوچھا" تمہارا کوئی بیوی ہے؟"

مقبول نے جواب دیا" نہیں"

کچھ دیر خاموش رہی مقبول چاہتا تھا باتیں ہوں چنانچہ اس نے سلسلہ کلام شروع کیا" اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ تم کشمیر کی رہنے والی ہو تمہارا نام شانتی ہے یہاں رہتی ہو۔۔۔۔یہ بتاؤ تم نے ففٹی روپیز کا معاملہ کیوں شروع کیا؟"

شانتی نے یہ بے تکلف جواب دیا" میرا فادر سری نگر میں ڈاکٹر ہے۔۔۔۔میں وہاں ہوپی ٹل میں نرس تھا ایک لڑکے نے مجھ کو خراب کر دیا۔۔۔میں بھاگ کر ادھر کو آ گئی یہاں ہم کو ایک آدمی ملا۔ وہ ہم کو ففٹی روپیز دیا۔۔۔۔بولا ہمارے ساتھ چلو ہم گیا بس کام چالو ہو گیا۔۔۔ہم یہاں ہوٹل میں آ گیا۔۔۔۔پر ہم ادھر کسی سے بات نہیں کرتی۔۔۔۔سب رنڈی لوگ

ہے۔۔۔۔کسی کو یہاں نہیں آنے دیتی۔"

مقبول نے کرید کرید کر تمام واقعات معلوم کرنا مناسب خیال نہ کیا کچھ اور باتیں ہوئیں جن سے اسے پتا چلا کہ شانتی کو جنسی معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جب اس کا ذکر آیا تو اس نے برا سا منہ بنا کر کہا "آئی ڈونٹ لائک ویٹ از بیڈ"

اس کے نزدیک ففٹی روپیز کا معاملہ کاروباری معاملہ تھا سرینگر کے ہسپتال میں جب کسی لڑکے نے اس کو خراب کیا تو جاتے وقت دس روپے دینا چاہے شانتی کو بہت غصہ آیا نوٹ پھاڑ دیا اس واقعے کا اس کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا پچاس روپے فیس خود بخود مقرر ہو گئی اب لذت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔۔۔۔چونکہ نرس رہ چکی تھی اس لیے بڑی محتاط رہتی تھی۔

ایک برس ہو گیا تھا اسے بمبئی آئے ہوئے اس دوران میں اس نے دس ہزار روپے بچائے ہوتے مگر اس کو ریس کھیلنے کی لت پڑ گئی پچھلی ریسوں پر اس کے پانچ ہزار اڑ گئے لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ نئی ریسوں پر ضرور جیتے گی "ہم اپنا لوس پورا کر لے گا۔"

اس کے پاس کوڑی کوڑی کا حساب موجود تھا۔ سو روپے روزانہ کما لیتی تھی جو فوراً بنک میں جمع کرا دیئے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ نہیں کمانا چاہتی تھی اس کو اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔

دو گھنٹے گزر گئے تو اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور مقبول سے کہا "اب تم جاؤ ہم کھانا کھائے گا اور سو جائے گا" مقبول اٹھ کر جانے لگا تو اس نے کہا "باتیں

کرنے آؤ تو صبح کے ٹائم آؤ شام کے ٹائم ہمارا نقصان ہوتی ہے۔''

مقبول نے ''اچھا'' کہا اور چل دیا

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب مقبول شانتی کے پاس پہنچا اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی آمد پسند نہیں کرے گی مگر اس نے کوئی ناگواری ظاہر نہ کی مقبول دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا اس دوران میں شانتی کو صحیح طریقے پر ساڑھی پہننی سکھائی لڑکی ذہین تھی، جلدی سیکھ گئی۔

کپڑے اس کے پاس کافی تعداد میں اور اچھے تھے یہ سب کے سب اس نے مقبول کو دکھائے اس میں بچپنا تھا نہ بڑھاپا شباب بھی نہیں تھا وہ جیسے کچھ بنتے بنتے ایک دم رک گئی تھی، ایک ایسے مقام پر ٹھہر گئی تھی جس کے موسم کا تعین نہیں ہو سکتا وہ خوبصورت تھی۔ نہ بدصورت، عورت تھی نہ لڑکی، وہ پھول تھی نہ کلی، شاخ تھی نہ تنا اس کو دیکھ کر بعض اوقات مقبول کو بہت الجھن ہوتی تھی وہ اس میں وہ نقطہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں اس نے خلط ملط ہونا شروع کیا تھا۔

شانتی کے متعلق اور زیادہ جاننے کے لیے مقبول نے اس سے ہر دوسرے تیسرے روز ملنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی کوئی خاطر مدارت نہیں کرتی تھی لیکن اب اس نے اس کو اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی ایک دن مقبول کو بہت تعجب ہوا جب شانتی نے اس سے کہا ''تم کوئی لڑکی مانگتا؟''

مقبول لیٹا ہوا تھا چونک کر اٹھا ''کیا کہا؟''

شانتی نے کہا ''ہم پوچھتی تم کوئی لڑکی مانگتا تم ہم لا کر دیتا''

مقبول نے اس سے دریافت کیا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے کیا خیال آیا کیوں اس

نے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئی مقبول نے اصرار کیا تو شانتی نے بتایا کہ مقبول سے ایک بیکار عورت سمجھتا ہے اس کو حیرت ہے کہ مرد اس کے پاس کیوں آتے ہیں جبکہ وہ اتنی ٹھنڈی ہے مقبول اس سے صرف باتیں کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ اسے کھلونا سمجھتا ہے۔ آج اس نے سوچا، مجھ جیسی ساری عورتیں تو نہیں۔ مقبول کو عورت کی ضرورت ہے۔ کیوں نہ وہ اسے ایک منگا دے۔

مقبول نے پہلی بار شانتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ایک دم وہ اٹھی اور چلانے لگی ''ہم کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ جاؤ چلے جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ ہمارے پاس کیوں آتا ہے تم۔۔۔۔ جاؤ''

مقبول نے کچھ نہ کہا خاموشی سے اٹھا اور چلا گیا

متواتر ایک ہفتہ وہ پیرے ژین ڈیری جاتا رہا مگر شانتی دکھائی نہ رہا آخر ایک صبح اس نے اس کے ہوٹل کا رخ کیا۔ شانتی نے دروازہ کھول دیا مگر کوئی بات نہ کی مقبول کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔۔ شانتی کے ہونٹوں پر سرخی پرانے بھدے طریقے پر لگی تھی۔ بالوں کا حال بھی پرانا تھا۔ ساڑھی کی پہناوٹ تو اور زیادہ بد زیب تھی مقبول اس سے مخاطب ہوا ''مجھ سے ناراض ہو اتم؟''

شانتی نے جواب نہ دیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی مقبول نے تند لہجے میں پوچھا'' بھول گئیں جو میں نے سکھایا تھا؟''

شانتی خاموش رہی مقبول نے غصے میں کہا ''جواب دو ورنہ یاد رکھو ماروں گا''

شانتی نے صرف اتنا کہا ''مارو''

مقبول نے اٹھ کر ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر جڑ دیا۔۔۔ شانتی بلبلا اٹھی

اس کی حیرت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مقبول نے جیب سے اپنا رومال نکالا غصے میں اس کے ہونٹوں کی بھدی سرخی پونچھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن مقبول اپنا کام کرتا رہا لپ اسٹک اٹھا کر نئی سرخی لگائی کنگھے سے اس کے بال سنوارے، پھر اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا ''ساڑھی ٹھیک کرو اپنی۔''

شانتی اٹھی اور ساڑھی ٹھیک کرنے لگی مگر ایک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور روتی روتی خود کو بستر پر گرا دیا مقبول تھوڑی دیر خاموش رہا جب شانتی کے رونے کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس کے پاس جا کر کہا'' شانتی اٹھو۔۔۔ میں جا رہا ہوں''

شانتی نے تڑپ کر کروٹ بدلی اور چلائی ''نہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم نہیں جا سکتے'' اور دونوں بازو پھیلا کر دروازے کے درمیان کھڑی ہو گئی ''تم گیا تو مار ڈالوں گی''

وہ ہانپ رہی تھی اس کا سینہ جس کے متعلق مقبول نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا جیسے گہری نیند سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مقبول کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے شانتی نے تلے اوپر بڑی سرعت سے کئی رنگ بدلے۔ اس کی نمناک آنکھیں چمک رہی تھیں سرخی لگے باریک ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے ایک دم آگے بڑھ کر مقبول نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

دونوں پلنگ پر بیٹھے تو شانتی نے اپنا سر نیوڑھا کر مقبول کی گود میں ڈال دیا۔ اس کے آنسو بند ہونے ہی میں نہ آتے تھے مقبول نے اس کو پیار کیا رونا بند کرنے کے لیے کہا تو وہ آنسوؤں میں اٹک اٹک کر بولی ''ادھر سرینگر میں۔۔۔۔ ایک

آدمی نے۔۔۔۔ہم کو مار دیا تھا۔۔۔۔۔ادھر ایک آدمی نے۔۔۔۔۔ہم کو زندہ کر دیا۔"

دو گھنٹے کے بعد جب مقبول جانے لگا تو اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر شانتی کے پلنگ پر رکھے اور مسکرا کر کہا "یہ لو اپنے ففٹی روپیز"

شانتی نے بڑے غصے اور بڑی نفرت سے نوٹ اٹھائے اور پھینک دیئے پھر اس نے تیزی سے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کا ایک دراز کھولا اور مقبول سے کہا "ادھر دیکھو۔۔۔دیکھو یہ کیا ہے؟"

مقبول نے دیکھا دراز میں سو سو کے کئی نوٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے مٹھی بھر کے شانتی نے اٹھائے اور ہوا میں اچھالے "ہم اب یہ نہیں مانگتا"

مقبول مسکرایا ہولے سے اس نے شانتی کے گال پر چھوٹی سی چپت لگائی اور پوچھا "اب تم کیا مانگتا ہے؟"

شانتی نے جواب دیا "تم کو" یہ کہہ کر وہ مقبول کے ساتھ چمٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔

مقبول نے اس کے بال سنوارتے ہوئے بڑے پیار سے کہا "روؤ نہیں۔۔۔۔تم نے جو مانگا ہے وہ تمہیں مل گیا ہے۔"

☆☆☆☆☆

شغل

یہ پچھلے دنوں کی بات ہے جب ہم برسات میں سڑکیں صاف کر کے اپنا پیٹ پال رہے تھے۔

ہم میں سے کچھ کسان تھے اور کچھ مزدوری پیشہ، چونکہ پہاڑی دیہاتوں میں روپے کا منہ دیکھنا بہت کم نصیب ہوتا ہے اس لیے ہم سب خوشی خوشی چھ آنے روز پر سارا دن پتھر ہٹاتے رہتے تھے جو بارشوں کے زور سے ساتھ والی پہاڑیوں سے لڑھک کر سڑک پر آ کر گرتے تھے۔ پتھروں کو سڑک پر سے ہٹانا تو خیر ایک معمولی بات تھی ہم تو اس اجرت پر ان پہاڑیوں کو ڈھانے پر بھی تیار تھے جو ہمارے گرد و پیش سیاہ اور ڈراؤنے دیوں کی طرح اکڑی کھڑی تھیں دراصل ہمارے بازو سخت سے سخت مشقت کے عادی تھے اس لیے یہ کام ہمارے لیے بالکل معمولی تھا البتہ جب کبھی ہمیں سڑک کو چوڑا کرنے کے لیے پتھر کاٹنا ہوتے تو رات کو ہمیں بہت تکان محسوس ہوتی تھی پٹھے اکڑ جاتے اور صبح کو بیدار ہوتے وقت ایسا محسوس ہوتا کہ وہ تمام پتھر جنہیں ہم گزشتہ روز کاٹتے اور پھوڑتے رہے ہیں ہمارے جسموں پر بوجھ ڈالے ہوئے ہیں مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔

ہمارا کام ہر روز صبح سات بجے شروع ہوتا تھا۔ جب طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طلائی کرنیں چیڑ کے دراز قد درختوں سے چھن چھن کر ہمارے پاس والے نالے کے خشم آلود پانی سے اٹکھیلیاں کر رہی ہوتیں اور آس پاس کی جھاڑیوں میں ننھے ننھے پرندے اپنے گلے پھلا پھلا کر چہچہا رہے ہوتے یوں کہیے کہ

ہم قدرت کو اپنے خواب سے بیدار ہوتا دیکھتے تھے صبح کی ہلکی پھلکی ہوا میں شبنم آلود سبز جھاڑیوں کی دلنواز سرسراہٹ، نالے میں سنگریزوں سے کھیلتے ہوئے کف آلود پانی کا شور اور برسات کے پانی میں بھیگی ہوئی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو، چند ایسی چیزیں تھیں جو ہمارے سنگین سینوں میں ایک ایسی لطافت پیدا کر دیتی تھیں جو زندگی کے اس دوزخ میں بھی بہشت کے خواب دکھانے لگتی۔

ہمیں ہر روز بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ یعنی سارا دن ہم سڑک کی موریوں اور پتھروں کو صاف کرتے رہتے تھے یہ کام دلچسپ نہ تھا مگر ہم نے اس کی ناخوشگوار یک آہنگی کو دور کرنے کے لیے ایک طریقہ ایجاد کر لیا تھا جب ہم سب اس پہاڑی کے نیچے جمع شدہ ملبے کو اپنے بیلچوں سے ہٹا رہے ہوتے جس کے سنگریزے ہر وقت سڑک پر گرتے رہتے تھے تو ہم ایک سر میں کوئی پہاڑی گیت شروع کر دیتے ملبے کے پتھروں سے ٹکرا کر ہمارے بیلچوں کی جھنکار اس گیت کی تال کا کام دیتی تھی یہ گیت اس افسردگی کو دور کر دیتا جو یہ غیر دلچسپ کام کرنے سے ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک اس کے سر ہماری چوڑی چھاتیوں میں سے نکلتے رہتے۔ ہم محسوس تک نہ کرتے کہ اس دوران میں ہم نے ملبے کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کر لیا ہے۔

موٹر لاریوں کی آمد و رفت سے بھی ہمارا دل بہلا رہتا تھا جو رنگ برنگ مسافروں کو کشمیر سے واپس یا کشمیر کی طرف لے جاتی رہتی تھیں جب کبھی کوئی لاری ہمارے پاس سے گزرتی تو ہم کچھ عرصہ کے لیے اپنی جھکی ہوئی کمریں سیدھی کر کے سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور زمین پر اپنے بیلچے ٹیک کر اس کو سامنے

والے موڑ کے عقب میں گم ہوتے دیکھتے رہتے۔ ان لاریوں کو اتنی دور تک دیکھتے رہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم تھوڑا سستا لیں مگر بعض اوقات ان لاریوں کی شاندار اسباب سے لدی ہوئی چھتیں اور ان کی کھڑکیوں سے مافروں کے لہراتے ہوئے ریشمی کپڑوں کی جھلک ہمارے دلوں میں ایک ناقابل بیان تلخی پیدا کر دیتی تھی اور ہم اپنے آپ کو ان پتھروں کی طرح فضول اور ناکارہ تصور کرنے لگتے تھے جن کو ہمارے بیلچوں کے دھکے ادھر ادھر پٹکتے رہتے تھے ان مسافروں کے طرح طرح کے لباس دیکھ کر جن پر یقیناً بہت سے روپے صرف آئے ہوں گے ہم غیر ارادی طور پر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔

ہم میں سے اکثر کا لباس پٹو کے تنگ پائجامے، گاڑھے کی قمیص اور لدھیانے کی صدری پر مشتمل تھا سب کے پائجامے یا تو گھٹنوں پر سے گھس گھس کر اتنے باریک ہو گئے تھے کہ ان میں سے جسم کے بالوں کی پوری نمائش ہوتی تھی یا بالکل پھٹے ہوئے تھے۔

قمیصوں اور صدریوں کی بھی یہی حالت تھی ان پر جگہ جگہ مختلف رنگ کے پیوند لگے ہوئے تھے قریب قریب ہم سب کی قمیصوں کے بٹن غائب تھے، اس لیے سینے عام طور پر کھلے رہتے تھے اور کام کرتے وقت ان پر پسینے کی بوندیں صاف نظر آسکتی تھیں۔

بارہ بجے کے قریب ہم کام چھوڑ کر کھانا کھانے کے لیے سڑک کے نیچے اتر کر پیڑ کے سائے تلے بیٹھ جاتے تھے یہ کھانا ہم صبح کپڑے میں باندھ کر اپنے ساتھ لاتے تھے تین ''ڈھوڈے'' (مکی کی موٹی روٹیاں) اور عام طور پر سرسوں کا ساگ

ہوتا تھا جس کو ہم اپنے بھوکے پیٹ میں ڈالتے تھے کھانے کے بعد ہم پانی عموماً نالے سے پیا کرتے اور جس روز بارش کی زیادتی کے باعث اس کا پانی زیادہ گدلا ہو جائے تو ہم دور سڑک کے اس پار چلے جایا کرتے تھے جہاں صاف پانی کا ایک چشمہ پھوٹتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم فوراً کام شروع کر دیا کرتے تھے گو ہمارا جی چاہتا تھا کہ نرم نرم گھاس پر لیٹ کر تھوڑی دیر ستا لیں اور پھر کام شروع کریں مگر یہ کیونکر ہو سکتا تھا جب کہ ہمیں ہر وقت اس بات کا خیال رہتا تھا کہ پورا کام کیے بغیر اجرت نہ ملے گی۔

ہمارا مطمح نظر کام کرنا اور اس حیلے سے اپنا پیٹ پالنا تھا اور چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہم میں سے کسی نے اگر اپنے کام میں ذرا سی سست رفتاری یا بے دلی کا اظہار کیا تو تاش کی گڈی سے ناکارہ جوکر کی طرح باہر نکال کر پھینک دیا جائے گا۔ اس لیے ہم دل لگا کر کام کیا کرتے تھے تاکہ ہمارے افسروں کو شکایت کا موقع نہ ملے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے افسر ہم پر بہت خوش تھے یہ کیونکر ہو سکتا ہے وہ بڑے آدمی ٹھہرے اس لیے ان کا جائز و ناجائز طور پر خفا ہونا بھی درست ہوتا ہے کبھی کبھی یہ لوگ ایسے ہی ہمارے کام کا معائنہ کرتے وقت اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے ہم پر برس پڑتے تھے لیکن ہم جوان کی بڑائی کو بخوبی سمجھتے تھے مہاراج، مہاراج کہہ کر ان کا غصہ سرد کر دیا کرتے تھے ہم جانتے تھے کہ ان کا غصہ بالکل بے جا ہے لیکن یہ احساس ہمارے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا نہیں کرتا تھا شاید اس لیے کہ کورنشوں نے ہم کو بالکل مردہ بنا رکھا ہے یا پھر اس کی وجہ یہ بھی ہو

سکتی ہے کہ ہم کو یہ خوف دامنگیر رہتا تھا کہ اگر ہم اپنے موجودہ کام سے ہٹا دیئے گئے تو ہماری روزی بند ہو جائے گی۔

ہم اپنے کام سے مطمئن تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہم تھوڑی مزدوری اور زیادہ کام کے مسئلے پر بہت کم غور کیا کرتے تھے اس کی ضرورت بھی کیا ہے اس لیے کہ یہ کام پڑھے لکھے آدمیوں کا ہے اور ہم بالکل ان پڑھ اور جاہل تھے دراصل بات یہ ہے کہ ہماری دنیا بالکل الگ تھلگ تھی جس کی سرحدیں پتھر توڑنے یا ان کو ہٹانے، بارہ بجے روٹی کھانے اور پھر کام کرنے اور اس کے بعد اپنے اپنے ڈیروں میں سو جانے تک ختم ہو جاتی تھیں۔ ہمیں ان حدود کے باہر کسی شے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پالنے کے دھندے میں ہم کچھ ایسی بری طرح پھنس کر رہ گئے تھے کہ اس کے باہر نکل کر ہم کسی اور شے کی خواہش کرنا ہی بھول گئے تھے۔

ہمارے کام پر سڑکوں کے محکمے کی طرف سے ایک نگران مقرر تھا جو دن کا بیشتر حصہ سڑک کے ایک طرف چارپائی بچھا کر بیٹھے رہنے میں گزار دیتا یہ ذات کا پنڈت تھا اونچے طبقے کا امتیازی نشان سیندور کے تلک کی صورت میں ہر وقت اس کی سفید پیشانی پر چمکتا رہتا تھا ہم اپنے نگران کو احترام اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اول اس لیے کہ وہ برہمن تھا اور دوسرے اس لیے کہ ہم اس کے ماتحت تھے چنانچہ ادھر ادھر کے دوسرے کاموں کے علاوہ ہم باری باری دن میں کئی بار اس کے پینے کے لیے حقہ تازہ کیا کرتے تھے اور آگ بنا کر اس کی چلمیں بھرا کرتے تھے۔

پنڈت کا کام صرف یہ تھا کہ صبح چارپائی پر اپنے گیروے رنگ کی کلف لگی پگڑی اور ریشمی کوٹ اتار کر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہماری حاضری لگائے اور پھر ایک بڑے سے رجسٹر میں کچھ درج کرنے کے بعد ادھر ادھر ٹہلتا رہے یا حقہ پیتا رہے۔ وہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا البتہ جب کبھی معائنے کے لیے کسی افسر کی موٹر ادھر سے گزرنا ہوتی تھی تو وہ اپنی چارپائی اٹھوا کر ہمارے پاس کھڑا ہو جایا کرتا تھا اس کی اس چالاکی پر ہم دل ہی دل میں بہت ہنسا کرتے تھے۔

ایک روز جبکہ صبح سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ہم بارہ بجے کھانا کھانے سے فارغ ہو کر حسب معمول اپنے کام میں مشغول تھے موٹر کے ہارن نے ہمیں چونکا دیا لاریوں کی بہ نسبت ہم موٹروں کے دیکھنے کے بہت شائق تھے اس لیے کہ ان میں ہماری بھوکی نظروں کے دیکھنے کے لیے عجیب وغریب چیزیں نظر آتی تھیں ہم کمریں سیدھی کر کے کھڑے ہو گئے اتنے میں موٹر کے عقب سے سبز رنگ کی ایک چھوٹی موٹر نمودار ہوئی جب یہ ہمارے قریب پہنچی تو ہم نے دیکھا کہ اس کی باڈی بارش کے ننھے ننھے قطروں کے نیچے چمک رہی ہے بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی شاید اس لیے کہ پچھلی سیٹ پر جو دو صاحب بیٹھے ہوئے تھے ان میں ایک اپنی رانوں پر گراموں فون رکھے بجا رہے تھے جب یہ موٹر ہمارے مقابل آئی تو ریکارڈ کی آواز سڑک کی ساتھ والی پہاڑی کے پتھروں سے ٹکرا کر فضا میں گونجی کوئی گا رہا تھا:

نہ میں کسی کا نہ کوئی میرا

چھایا چاروں اور اندھیرا

اب کچھ سوجھت ناہیں

موہے، اب کچھ۔۔۔۔۔

آواز میں بے حد درد تھا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ ہم شاید بحر ظلمات میں ڈوب گئے ہیں جب موڑ اپنی نیم وا کھڑکیوں سے اس گیت کے درد ناک سر بکھیرتی ہوئی ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ہم سب نے ایک آہ بھر کر اپنا کام شروع کر دیا۔

شام کے قریب جب سورج کی سرخ اور گرم ٹکیا پگھلے ہوئے تانبے کا رنگ اختیار کر کے ایک سیاہ پہاڑی کے پیچھے چھپ رہی تھی اور اس کی عنابی کرنیں دراز قد درختوں کی چوٹیوں سے کھیل رہی تھیں سبز رنگ کی وہی موڑ اس طرف سے واپس آتی دکھائی دی جدھر وہ دوپہر کو گئی تھی جب ہم نے اس کے ہارن کی آواز سنی تو کام چھوڑ کر اس کو دیکھنے لگے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ ہمارے آگے سے گزر گئی اور پھر دفعتاً ہم سے آدھی جریب کے فاصلے پر کھڑی ہوگئی وہ باجا جو اس میں بج رہا تھا خاموش ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پچھلی سیٹ سے ایک نوجوان دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اپنی پتلون کو کمر پر سے درست کرتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا اور آہستہ آہستہ اس پل کی طرف روانہ ہوگیا جو سامنے نالے پر بندھا ہوا تھا یہ خیال کر کے کہ وہ نالے کے پانی کا نظارہ کرنے کے لیے گیا ہے جیسا کہ عام طور پر ادھر سے گزرنے والے مسافر کیا کرتے تھے ہم اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

ابھی ہمیں اپنا کام شروع کیے پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ گزرا ہوگا کہ پل کی طرف سے تالی کی آواز بلند ہوئی ہم نے مڑ کر دیکھا پتلون پوش نوجوان پل پر سے سڑک کے ساتھ پتھروں سے چنی ہوئی دیو کے پاس کھڑا غالباً موٹر میں اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر رہا تھا سنگین منڈیر پر اس نوجوان سے کچھ دور ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم میں سے ایک نے اپنے بیلچے کو بڑے زور سے موری کی گیلی مٹی میں گاڑتے ہوئے کہا "یہ رام دائی ہے"

کالو نے جو اس کے پاس کھڑا تھا دریافت کیا "رام دئی؟"

"سنتو چمار کی لڑکی اور کون!" اس کے لہجے میں بیلچے کے لوہے ایسی سختی تھی۔

ہم باقی چار حیران تھے کہ اس گفتگو کا مطلب کیا ہے۔ اگر وہ لڑکی جو منڈیر پر بیٹھی ہے سنتو چمار کی لڑکی ہے تو کون سی اہم بات ہے کہ ہمارا ساتھی اس قدر تیز بول رہا ہے ہم غور کر رہے تھے کہ فضل نے جو ہم سب سے عمر میں بڑا تھا اور نماز روزے کا بہت پابند تھا اپنی ڈاڑھی کو کھجلاتے ہوئے نہایت ہی متفکرانہ لہجے میں کہا:

"دنیا میں ایک اندھیر مچا ہے۔۔۔۔۔خدا معلوم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟"

یہ سن کر ہم باقی تین اصل معاملے سے آگاہ ہو کر سب کچھ سمجھ گئے اور اس احساس نے ہمارے دلوں پر غم اور غصے کی ایک عجیب و غریب کیفیت طاری کر دی۔

تالی کی آواز سن کر موٹر کی پچھلی نشست سے پتلون پوش کے ساتھی نے اپنا سر

باہر نکالا اور یہ دیکھ کر کہ اس کا دوست اسے بلا رہا ہے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ہمارے قریب سے گزرتا ہوا پل کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہم بیوقوف بکریوں کی طرح اسے اپنے دوست کے پاس جاتا دیکھتے رہے۔

جب پتلون پوش نوجوان کا دوست اس کے پاس پہنچ گیا تو وہ دونوں لڑکی کی طرف بڑھے اور اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں یہ دیکھ کر کالو پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور خشم آلود لہجے میں بولا

''بدمعاش۔۔۔۔''

فضل نے سرد آہ بھری اور مغموم لہجے میں کہنے لگا'' جب سے یہ سڑک بنی ہے ایسے بابوؤں کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی ہے یہاں کے تمام علاقوں میں گندگی پھیل گئی ہے لوگ کہتے ہیں کہ یہ سڑک بننے سے بہت آرام ہو گیا ہے ہو گا، مگر اس قسم کے بے شرمی کے نظارے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے خدا بچائے۔''

اس دوران میں پتلون پوش کے ساتھی نے لڑکی کو بازو سے پکڑ لیا اور غالباً اس کو اٹھ کر چلنے کے لیے کہا مگر وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی یہ دیکھ کر کالو سے نہ رہا گیا اور اس نے رام پرشاد سے کہا'' آؤ یہ لوگ تو اب دست درازی کر رہے ہیں۔''

کالو یہ کہہ کر اکیلا ہی اس جانب بڑھنے کو تھا کہ ہم نے اسے روک دیا اور یہ مشورہ دیا کہ تمام معاملہ پنڈت کے گوش گزار کر دیا جائے جو چارپائی پر سو رہا ہے اور پھر جو وہ کہے اس پر عمل کیا جائے اس تجویز کو معقول خیال کر کے ہم سب پنڈت کے پاس گئے اور اسے جگا کر سارا قصہ سنا دیا اس نے ہماری گفتگو کو بڑی بے پروائی سے سنا جیسے کوئی بات ہی نہیں اور ان دو نوجوانوں کی طرف دیکھ کر جواب

رام دئی کو خدا معلوم کس طریقے سے منا کر اپنے ساتھ لا رہے تھے کہا ''جاؤ تم اپنا کام کرو میں ان سے خود دریافت کر لوں گا''

جب پنڈت رام دئی اور دو نوجوان ہمارے پاس سے گزرے تو ہم نے دیکھا کہ نوجوانوں کے چہروں پر ایک حیوانی جھلک ناچ رہی ہے اور پنڈت بڑے ادب سے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے رام دئی کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

موٹر کے پاس پہنچ کر پنڈت نے آگے بڑھ کر اس کا دروازہ کھولا پہلے پتلون پوش پھر رام دئی اور اس کے بعد دوسرا نوجوان موٹر میں داخل ہو گئے ہمارے دیکھتے دیکھتے موٹر چلی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی اور ہم آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

''شیطان! مردود!'' کالو نے بڑے اضطراب سے یہ دو لفظ ادا کیے۔

اتنے میں پنڈت آ گیا اور ہم کو مضطرب دیکھ کر مصنوعی آواز میں کہنے لگا ''میں نے ان سے دریافت کیا ہے کوئی بات نہیں، وہ لڑکی کو ذرا موٹر کی سیر کرانا چاہتے تھے انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں تھوڑی دور لے جا کر اسے چھوڑ دیں گے۔۔۔۔ امیر آدمی ہیں ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔''

یہ کہہ کر پنڈت چلا گیا۔

ہم دیر تک خدا معلوم کن گہرائیوں میں غرق رہے کہ دفعتاً فضل کی آواز نے ہمیں چونکا دیا دو مرتبہ زور سے تھوک کر اس نے اپنے ہاتھوں کو گیلا کیا اور بیلچے کو سنگریزوں کے ڈھیر میں گاڑتے ہوئے کہا ''اگر امیر آدمیوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی بہو بیٹیوں کا اللہ بیلی ہے۔''

☆☆☆☆☆☆

شکاری عورتیں

میں آج آپ کو چند شکاری عورتوں کے قصے سناؤں گا میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی کبھی ان سے واسطہ پڑا ہوگا۔

میں بمبئی میں تھا فلمستان سے عام طور پر برقی ٹرین سے چھ بجے گھر پہنچ جایا کرتا تھا لیکن اس روز مجھے دیر ہوگئی اس لیے کہ ''شکاری'' کی کہانی پر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔

میں جب بمبئے سنٹرل کے اسٹیشن پر اترا، تو میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جو تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ سے باہر نکلی اس کا رنگ گہرا سانولا تھا ناک نقشہ ٹھیک تھا جوان تھی، اس کی چال بڑی انوکھی سی تھی ایسا لگتا تھا کہ وہ فلم کا منظر نامہ لکھ رہی ہے۔

میں اسٹیشن سے باہر آیا اور پل پر وکٹوریا گاڑی کا انتظار کرنے لگا میں تیز چلنے کا عادی ہوں اس لیے میں دوسرے مسافروں سے بہت پہلے باہر نکل آیا تھا۔

وکٹوریا آئی اور میں اس میں بیٹھ گیا میں نے کوچوان سے کہا کہ آہستہ آہستہ چلے اس لیے کہ فلمستان میں کہانی پر بحث کرتے کرتے میری طبیعت مکدر ہوگئی تھی موسم خوشگوار تھا وکٹوریا والا آہستہ آہستہ پل پر سے اترنے لگا۔

جب ہم سیدھی سڑک پر پہنچے تو ایک آدمی سر پر ٹاٹ سے ڈھکا ہوا مٹکا اٹھائے صدا لگا رہا تھا ''قلفی۔۔۔۔قلفی!''

جانے کیوں میں نے کوچوان سے وکٹوریا روک لینے کے لیے کہا، اور اس قلفی بیچنے والے سے کہا کہ ایک قلفی دو۔۔۔۔میں اصل میں اپنی طبیعت کا تکدر کسی نہ

کسی طرح دور کرنا چاہتا تھا۔

اس نے مجھے ایک دونے میں قلفی دی میں کھانے ہی والا تھا کہ اچانک کوئی دھم سے وکٹوریا میں آن گھا کافی اندھیرا تھا میں نے دیکھا تو وہی گہرے رنگ کی سانولی لڑکی تھی۔

میں بہت گھبرایا۔۔۔۔وہ مسکرا رہی تھی دونے میں میری قلفی پگھلنا شروع ہو گئی

اس نے قلفی والے سے بڑے بے تکلف انداز میں کہا ''ایک مجھے بھی دو''

اس نے دے دی

گہرے سانولے رنگ کی لڑکی نے اسے ایک منٹ میں چٹ کر دیا اور وکٹوریا والے سے کہا ''چلو''

میں نے اس سے پوچھا ''کہاں؟''

''جہاں بھی تم چاہتے ہو''

''مجھے تو اپنے گھر جانا ہے''

''تو گھر ہی چلو''

''تم ہو کون؟''

''کتنے بھولے بنتے ہو''

میں سمجھ گیا کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا ''گھر جانا ٹھیک نہیں۔۔اور یہ وکٹوریا بھی غلط ہے۔۔۔کوئی ٹیکسی لے لیتے ہیں''

وہ میرے اس مشورے سے بہت خوش ہوئی۔۔۔میری سمجھ میں نہیں آتا تھا

کہ اس سے نجات کیسے حاصل کروں۔۔۔۔اسے دھکا دے کر باہر نکالتا تو اودھم مچ جاتا پھر میں نے یہ سوچا کہ عورت ذات ہے اس سے فائدہ اٹھا کر کہیں وہ یہ واویلا نہ مچا دے کہ میں نے اس سے ناشائستہ مذاق کیا ہے۔

وکٹوریا چلتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ یہ مصیبت کیسے ٹل سکتی ہے آخر ہم بے بی ہسپتال کے پاس پہنچ گئے وہاں ٹیکسیوں کا اڈہ تھا میں نے وکٹوریا والے کو اس کا کرایہ ادا کیا اور ایک ٹیکسی لے لی ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے

ڈرائیور نے پوچھا ''کدھر جانا ہے صاحب!''

میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے اس سے زیر لب کہا ''مجھے کہیں بھی نہیں جانا ہے۔۔۔۔یہ لو دس روپے۔۔۔اس لڑکی کو تم جہاں بھی لے جانا چاہو لے جاؤ''

وہ بہت خوش ہوا۔

دوسرے موڑ پر اس نے گاڑی ٹھہرائی اور مجھ سے کہا ''صاحب آپ کو سگریٹ لینے تھے۔۔۔اس ایرانی کے ہوٹل سے سستے مل جائیں گے''

میں فوراً دروازہ کھول کر باہر نکلا گہرے رنگ کی لڑکی نے کہا ''دو پیکٹ لانا''

ڈرائیور اس سے مخاطب ہوا ''تین لے آئیں گے'' اور اس نے موٹر اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا

☆☆☆☆

بمبئی ہی کا واقعہ ہے میں اپنے فلیٹ میں اکیلا بیٹھا تھا میری بیوی شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی کہ ایک گھاٹن جو بڑے تیکھے نقشوں والی تھی بے دھڑک اندر چلی

آئی میں نے سوچا شاید نوکری کی تلاش میں آئی ہے مگر وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔۔۔میرے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر مسکرانے لگی

میں نے اس سے پوچھا ''کون ہو تم؟''

''تم پہچانتے نہیں''

''میں نے آج پہلی دفعہ تمہیں دیکھا ہے''

''سالا جھوٹ مت بولا۔۔۔تو روز دیکھتا ہے''

میں بڑی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔۔۔۔لیکن تھوڑی دیر کے بعد میرا نوکر فضل دین آ گیا۔۔۔اس نے اس تیکھے نقشوں والی گھاٹن کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

☆☆☆☆☆

یہ واقعہ لاہور کا ہے

میں اور میرا ایک دوست ریڈیو اسٹیشن جا رہے تھے جب ہمارا تانگہ اسمبلی ہال کے پاس پہنچا تو ایک تانگہ ہمارے عقب سے نکل کر آگے آ گیا اس میں ایک برقع پوش عورت تھی جس کے نقاب نیم وا تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی شرارت ناچنے لگی میں نے اپنے دوست سے جو پچھلی نشست پر بیٹھا تھا کہا ''یہ عورت بدچلن معلوم ہوتی ہے''

''تم ایسے فیصلے ایک دم مت دیا کرو''

''بہت اچھا جناب! میں آئندہ احتیاط سے کام لوں گا''

برقع پوش عورت کا تانگہ ہمارے تانگے کے آگے آگے تھا وہ ٹکٹکی لگائے ہمیں دیکھ رہی تھی میں بڑا بزدل ہوں، لیکن اس وقت مجھے شرارت سوجھی اور میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آداب عرض کر دیا۔

اس کے آدھ دھکے چہرے پر مجھے کوئی ردعمل نظر نہ آیا جس سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی

میرا دوست کہنے لگا اس کو میری اس ناکامی سے بڑی مسرت ہوئی لیکن جب ہمارا تانگہ شملہ پہاڑی کے پاس پہنچ رہا تھا تو برقع پوش عورت اپنا تانگہ ٹھہرا لیا اور (میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا) وہ نیم اٹھی ہوئی نقاب کے اندر مسکراتی ہوئی آئی اور ہمارے تانگے میں بیٹھ گئی۔۔۔۔میرے دوست کے ساتھ

میری سمجھ میں نہ آیا کیا کیا جائے میں نے اس برقع پوش عورت سے کوئی بات نہ کی، اور تانگے والے سے کہا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن کا رخ کرے۔

میں اسے اندر لے گیا۔۔۔۔ڈائریکٹر صاحب سے میرے دوستانہ مراسم تھے میں نے ان سے کہا ''یہ خاتون ہمیں رستے میں پڑی ہوئی مل گئی آپ کے پاس لے آیا ہوں، اور درخواست کرتا ہوں کہ انہیں یہاں کوئی کام دلوا دیجئے''

انہوں نے اس کی آواز کا امتحان کرایا جو کافی اطمینان بخش تھا جب وہ آڈیشن دے کر آئی تو اس نے برقع اتارا ہوا تھا میں نے اسے غور سے دیکھا اس کی عمر پچیس کے قریب ہوگی رنگ گورا آنکھیں بڑی بڑی لیکن اس کا جسم ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے شکرقندی کی طرح بھوبل میں ڈال کر باہر نکالا گیا ہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں چپڑاسی آیا اس نے کہا کہ باہر ایک تانگہ والا کھڑا ہے، وہ کرایہ مانگتا ہے میں نے سوچا شاید زیادہ عرصہ گزرنے پر وہ تنگ آ گیا ہے، چنانچہ میں باہر نکلا میں نے اپنے تانگے والے سے پوچھا ''بھئی کیا بات ہے ہم کہیں بھاگ تو نہیں گئے''

وہ بڑا حیران ہوا ''کیا بات ہے سرکار!''

''تم نے کہلا بھیجا ہے کہ میرا کرایہ ادا کرو''

''میں نے جناب کسی سے کچھ بھی نہیں کہا''

اس کے تانگے کے ساتھ ہی ایک دوسرا تانگہ کھڑا تھا اس کا کوچوان جو گھوڑے کو گھاس کھلا رہا تھا، میرے پاس آیا اور کہا ''وہ عورت جو آپ کے ساتھ گئی تھی، کہاں ہے؟''

''اندر ہے۔۔۔۔۔کیوں؟''

''جی اس نے دو گھنٹے مجھے خراب کیا ہے۔۔۔۔۔کبھی ادھر جاتی تھی، کبھی ادھر۔۔۔میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے کہاں جانا ہے''

''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''جی میں اپنا کرایہ چاہتا ہوں''

''میں اس سے لے کر آتا ہوں''

''میں اندر گیا۔۔۔۔اس برقع پوش عورت سے جو اپنا برقع اتار چکی تھی کہا'' تمہارا تانگے والا کرایہ مانگتا ہے

وہ مسکرائی ''میں دے دوں گی''

میں نے اس کا پرس جو صوفے پر پڑا تھا اٹھایا اس کو کھولا۔۔۔۔مگر اس میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا بس کے چند ٹکٹ تھے اور دو بالوں کی پنیں۔۔۔اور ایک واہیات قسم کی لپ اسٹک۔

میں نے وہاں ڈائریکٹر کے دفتر میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا ان سے رخصت طلب کی باہر آ کر اس کے تانگے والے کو دو گھنٹوں کا کرایہ ادا کیا، اور اس عورت کو اپنے دوست کی موجودگی میں کہا "تمہیں اتنا تو خیال ہونا چاہیے کہ تم نے تانگہ لے لیا ہے اور تمہارے پاس ایک کوڑی بھی نہیں۔"

وہ کھسیانی ہو گئی "میں۔۔۔میں۔۔۔آپ بڑے اچھے آدمی ہیں"

"میں بہت برا ہوں۔۔۔تم بڑی اچھی ہو۔۔۔۔کل سے ریڈیو اسٹیشن آنا شروع کر دو۔۔۔تمہاری آمدن کی صورت پیدا ہو جائے گی یہ بکواس جو تم نے شروع کر رکھی ہے اسے ترک کر دو۔"

میں نے اسے مزنگ کے پاس چھوڑ دیا۔۔۔میرا دوست واپس چلا گیا۔۔۔۔اتفاقاً مجھے ایک کام سے وہاں جانا پڑا۔

دیکھا کہ میرا دوست اور وہ عورت اکٹھے جا رہے تھے۔

☆☆☆☆

یہ بھی لاہور ہی کا واقعہ ہے

چند روز ہوئے میں نے اپنے دوست کو مجبور کیا کہ وہ مجھے دس روپے دے اس دن بنک بند تھے اس نے معذوری کا اظہار کیا لیکن جب میں نے اس پر زور دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ دس روپے پیدا کرے اس لیے کہ مجھے اپنی ایک علت

پوری کرنا ہے، جس سے تم بخوبی واقف ہو، تو اس نے کہا ''اچھا'' میرا ایک دوست ہے وہ غالباً اس وقت کافی ہاؤس میں ہوگا وہاں چلتے ہیں امید ہے کام بن جائے گا۔

ہم دونوں تانگے میں بیٹھ کر کافی ہاؤس پہنچے مال روڈ پر بڑے ڈاک خانے کے قریب ایک تانگہ جا رہا تھا اس میں نسواری رنگ کا برقع پہنے ایک عورت بیٹھی تھی اس کی نقاب پوری کی پوری اٹھی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔وہ تانگے والے سے بڑے بے تکلف انداز میں گفتگو کر رہی تھی ہمیں اس کے الفاظ سنائی نہیں دئے لیکن اس کے ہونٹوں کی جنبش سے جو کچھ مجھے معلوم ہونا تھا ہو گیا۔

ہم کافی ہاؤس پہنچے تو عورت کا تانگہ بھی وہیں رک گیا میرے دوست نے اندر جا کر دس روپوں کا بندوبست کیا اور باہر نکلا۔۔۔۔۔وہ عورت نسواری برقعے میں جانے کس کی منتظر تھی۔

ہم واپس گھر آنے لگے تو رستے میں خربوزوں کے ڈھیر نظر آ گئے ہم دونوں تانگے سے اتر کر خربوزے پرکھنے لگے۔

ہم نے باہم فیصلہ کیا کہ اچھے نہیں نکلیں گے کیونکہ ان کی شکل وصورت بڑی بے ڈھنگی تھی۔۔۔جب اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی نسوانی برقع تانگے میں بیٹھا خربوزے دیکھ رہا ہے۔

میں نے اپنے دوست سے کہا'' خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔۔۔۔۔آپ نے ابھی تک یہ نسواری رنگ نہیں پکڑا''

اس نے کہا'' ہٹاؤ جی۔۔۔یہ سب بکواس ہے''

ہم وہاں سے اٹھ کر تانگے میں بیٹھے میرے وقت کو قریب ہی ایک کیمسٹ کے ہاں جانا تھا وہاں دس منٹ لگے باہر نکلے تو دیکھا کہ نسواری برقع اسی تانگے میں بیٹھا جا رہا تھا۔

میرے دوست کو بڑی حیرت ہوئی ''یہ کیا بات ہے؟ یہ عورت کیوں بیکار گھوم رہی ہے؟''

ہمارا تانگہ ہال روڈ کو مڑنے ہی والا تھا کہ وہ نسواری برقع پھر نظر آیا میرے دوست گو کنوارے ہیں لیکن بڑے زاہد ان کو جانے کیوں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ اس نسوارے برقعے سے بڑی بلند آواز میں کہا'' آپ کیوں آوارہ پھر رہی ہیں۔۔۔۔آیئے ہمارے ساتھ''

اس کے تانگے نے فوراً رخ بدلا اور میرا دوست سخت پریشان ہو گیا جب وہ نسواری برقع ہم کلام ہوا تو اس نے اس سے کہا'' آپ کو تانگے میں آوارہ گردی کرنے کی کیا ضرورت ہے میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں''

میرے دوست نے اس نسواری برقعے سے شادی کر لی۔

☆☆☆☆☆☆

شوشو

گھر میں بڑی چہل پہل تھی تمام کمرے لڑکے لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لیے بلبلا رہے ہیں تو دوسرے کمرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی لیے بے سری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی بس گائے جا رہی ہیں نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل کی شہ نشینیوں تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔

کیوں نہ ہو ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دلہنیں بیاہ کر لائے تھے۔

رات کے 11 بجے کے لگ بھگ دونوں ڈولیاں آئیں اور گلی میں اس قدر شور برپا ہوا کہ الامان مگر وہ نظارہ بڑا روح افزا تھا جب گلی کی سب شوخ و شنگ لڑکیاں باہر نکل آئیں اور تتلیوں کی طرح ادھر ادھر پھڑ پھڑانے لگیں۔

ساڑھیوں کی ریشمیں سرسراہٹ، کلف لگی شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔ تمتماتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں اونچی ایڑھی کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں، لچکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے لہجے، پھڑکتی ہوئی رگیں اور پھر ان الہڑ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں۔۔۔ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ گلی کے پتھریلے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا

ہے۔

عباس میرے پاس کھڑا تھا ہم دونوں عورتوں کے ہجوم میں گھرے تھے دفعتاً عباس نے گلی کے نکڑ پر نظریں گاڑ کر کہا ''شوشو کہاں ہے؟''

میں نے جواب دیا ''مجھے اس وقت تمہارے سوال کا جواب دینے کی فرصت نہیں ہے''

میں اس ہجوم میں اس بھونرے کی مانند کھڑا تھا جو پھولوں بھری کیاری دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس پھول پر بیٹھے۔

عباس نے رونی آواز میں کہا ''وہ نہیں آئی''

''تو کیا ہوا۔۔۔۔باقی تو سب موجود ہیں۔۔۔۔۔ارے۔۔۔۔دیکھو تو وہ نیلی ساڑھی میں کون ہے؟۔۔۔۔۔شوشو'' میں نے عباس کا ہاتھ دبایا

عباس نے غور سے دیکھا ''نیلی ساڑھی میں۔۔۔۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''علاج کراؤ اپنی آنکھوں کا۔۔۔۔چغد کہیں کے، یہ شوشو ہے؟''

''کیوں وہ نہیں ہے کیا؟'' میں نے پھر نیلی ساڑھی کی طرف غور سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ایکا ایکی اس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں کچھ اس طور پر کہ اس کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ سنبھلی اور فوراً ہی منہ سے لال جیب نکال کر میرا منہ چڑایا اپنی سہیلی کے کان میں کچھ کہا۔

اس سہیلی نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔۔۔۔۔میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا

عباس نے جو اپنا اطمینان کرنے کے لیے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھ رہا تھا بلند آواز میں کہا" بخدا تم اس کی توہین کر رہے ہو۔۔۔ گدھے کہیں کے۔۔۔ عورت کے معاملے میں نرے احمق ہو۔۔۔ کاٹھ کی کوئی پتلی نیلے رنگ میں لپیٹ لپاٹ کر تمہارے سامنے رکھ دی جائے تم اسی کی بلائیں لینا شروع کر دو گے۔"

یہ الفاظ اتنی اونچی آواز میں ادا کیے گئے تھے کہ اس نیلی ساڑھی والی نے سن لیے جب وہ ہمارے پاس سے گزرنے لگی تو خود بخود ٹھٹک گئی ایک لحظے کے لیے اس کے قدم رکے گویا ہم میں سے کسی نے اس کو مخاطب کیا ہے پھر فوراً ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی خفت دور کرنے کے لیے اس نے یونہی پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا" ارے۔۔۔ آئینہ تو کہاں اڑ گئی؟"

مجھے موقع ملا میں نے جھٹ سے عباس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اچھی طرح دبا کر اس سے کہا" آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی مگر میرا نام محمد امین ہے۔۔۔ مجھے نیل کنٹھ بھی کہتے ہیں"

جل ہی تو گئی مگر ہم زیر لب مسکراتے آگے بڑھ گئے چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ عباس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا" شوشو ابھی تک نہیں آئی"

"تو میں کیا کروں۔۔۔ میرے سر پر نمدہ باندھ دیجیے تو میں ابھی سرکار کے لیے اسے تلاش کر کے لے آتا ہو۔۔۔ آخر یہ کیا حماقت ہے بھئی تم تماشا بھی دیکھنے دو گے کہ نہیں؟ اور پھر جناب یہ تو بتائیے اگر وہ یہاں موجود بھی ہو تو آپ اس سے ملاقات کیونکر کر سکتے ہیں۔۔۔ آپ کوئی امریکی ناول تو نہیں پڑھ رہے

کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے۔"

عباس میری بات فوراً سمجھ گیا وہ اتنا بیوقوف نہیں تھا چنانچہ ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے گلی سے نکل کر بازار میں چلے گئے موڑ پر رام بھروسے پنواڑی کی دکان کھلی تھی وہ بجلی کے قمقمے کے نیچے سر جھکائے اونگھ رہا تھا ہم نے اس سے دو پان بنوائے اور وہیں بازار میں کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے دیر تک ہم ہندوستان میں مرد عورت کے درمیان اجنبیت چلی آ رہی ہے اس کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جب ایک بج گیا تو عباس جمائی لے کر اٹھا اور کہنے لگا "بھئی اب نیند آ رہی ہے۔۔۔۔اس حسرت کو ساتھ لیے جا رہا ہوں کہ شوشو کو نہ دیکھ سکا سچ کہتا ہوں امین وہ لڑکی۔۔۔۔۔میں اب تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہے؟"

عباس نے اپنے گھر کا رخ کیا اور میں نے اپنے گھر کا راستے میں سوچتا رہا کہ عباس نے شوشو جیسی معمولی لڑکی میں ایسی کون سی غیر معمولی چیز دیکھی ہے جو ہر وقت اس کا ذکر کرتا رہتا ہے۔عباس کے مذاق کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بڑا اونچا ہے مگر یہاں اسے کیا ہو گیا تھا؟۔۔۔۔۔۔شوشو۔۔۔۔شو شو۔۔۔۔ارے یہ کیا ہے؟۔۔۔۔۔۔دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپر منٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں۔۔۔۔شوشو ۔۔۔۔ایک دو مرتبہ آپ بھی دہرائیے۔۔۔۔۔ذرا جلدی جلدی۔۔۔۔کیا آپ کو لذت محسوس ہوئی؟۔۔۔۔۔ضرور ہوئی ہو گی مگر کیوں؟ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں عباس کی محبوبہ شوشو کے بارے میں خواہ مخواہ کیوں غور کرنے لگا ہوں اس

میں کوئی ایسی چیز ہے ہی نہیں جو غور افروز ہو مگر۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ یہ شوشو نام میں دلچسپی ضرور تھی اور کیا کہا تھا میں نے لذت بھی!

شوشو میں بانجو کے تھرکتے ہوئے تاروں کی جھنکار سی پائی جاتی تھی آپ یہ نام پکاریئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پر زور سے گز پھیر دیا ہے۔

شوشو۔۔۔۔ سوشیلا کا دوسرا نام ہے یعنی اس کی بگڑی ہوئی شکل مگر اس کے باوجود اس میں کتنی موسیقی ہے۔۔۔۔ سوشیلا۔۔۔۔ شوشو۔۔۔۔ شوشو۔۔۔۔ سوشیلا۔۔۔۔ غلط۔۔۔۔ سوشیلا میں شوشو کی سی موسیقیت ہرگز نہیں ہو سکتی۔

فرنگی شاعر بائرن شکیل تھا مگر اس میں وہ کون سی شے تھی جو عورتوں کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتی تھی؟ اس کا لنگڑا کر چلنا گریٹا گاربو قطعاً خوش شکل نہیں ہے مگر اس میں کون سی چیز ہے جو فلمی تماشائیوں پر جادو کا کام کرتی ہے؟۔۔۔۔ اس کا ذرا بگڑے ہوئے انگریزی لہجے میں باتیں کرنا۔۔۔۔ یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات اچھی بھلی شے کو بگاڑنے سے اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے؟

سوشیلا پندرہ سولہ برس کی ایک معمولی لڑکی ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے اس عمر میں وہ ان تمام چیزوں کی مالک ہے جو عام نوجوانوں کے سینے میں ہلچل پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں مگر عباس کی نظروں میں یہ کوئی خوبی نہ تھی عام نوجوانوں کی طرح عباس کا دل گھاس کی پتی کی مانند نہیں تھا جو ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ ہی کانپنا شروع کر دیتی ہے۔۔۔۔ خدا جانے وہ اس کی کس

ادا پر مرتا تھا جو میرے ذہن سے بالاتر تھی۔

میں نے سوشیلا کی شکل وصورت اور اس کی صناعانہ قدر و قیمت کے متعلق کبھی غور نہیں کیا تھا مگر نہ جانے میں اس روز اس کے متعلق کیوں سوچتا رہا بار بار وہ میرے ذہن میں آ رہی تھی اور ہر بار میں سوشیلا کو چھوڑ کر اس کے مختصر نام شوشو کی موسیقی میں گم ہو جاتا تھا انہی خیالات میں غرق گلی کے موڑ پر پہنچ گیا اور مجھے اس چیز کا احساس اس وقت ہوا جب میں نے دفعتاً وہاں کی فضا کو غیر معمولی طور پر خاموش پایا مکان میری نظروں کے سامنے تھا اس کے باہر گلی کی دیوار کے ساتھ ایک برقی قمقمہ لٹک رہا تھا جس کی چوندھیا دینے والی روشنی ساری گلی میں بکھری ہوئی تھی۔۔۔۔ مجھے اس قمقمے کے ''تجرد'' پر بڑا ترس آیا گلی بالکل سنسان تھی اور وہ قمقمہ متحیر سا معلوم ہوتا تھا۔

گھر میں داخل ہوا تو وہاں بھی خاموشی تھی البتہ کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی لرزاں صدا اور پھر ساتھ ہی اس کی ماں کی خوب آلود آواز سنائی دیتی تھی ڈیوڑھی کے ساتھ والا کمرہ کھول کر میں صوفے پر بیٹھ گیا پاس ہی تپائی پر ''رومان'' پڑا تھا اس کو اٹھا کر میں نے ورق گردانی شروع کر دی ورق الٹتے الٹتے اختر کی غزل پر نظریں جم گئیں مطلع کس قدر حسین تھا۔

نہ بھولے گا تیرا راتوں کو شرماتے ہوئے آنا
رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا

مجھے نیند آ گئی کلاک کی طرف دیکھا تو چھوٹی سوئی دو کے ہندسے کے پاس پہنچ چکی تھی اور اس کا اعلان کرنے کے لیے ارتعاش پیدا ہو رہا تھا ٹن ٹن۔۔۔۔ ٹن

ٹن ٹن۔۔۔۔ٹن

''دو بج گئے'' میں اٹھا اور سونے کے ارادے سے سیڑھیاں طے کر کے اپنی خوابگاہ میں پہنچا بہار کے دن تھے اور موسم خشک میری خواب گاہ کی ایک کھڑکی باہر گلی کی طرف کھلتی ہے جس کے پیازی رنگ کے ریشمی پردے میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بڑی پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے۔

میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور سبز رنگ کا قمقمہ روشن کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں نیند اور بیداری کے درمیان صرف ایک لحظہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں کسی کے بولنے کی گنگناہٹ آئی اس پر ملتی ہوئی پلکیں کھل گئیں اور میں نے غنودگی دور کرتے ہوئے غور سے سننا شروع کیا ساتھ والے کمرے میں کوئی بول رہا تھا یکا یک کسی کی دلکش ہنسی کی مترنم آواز بلند ہوئی اور پھلجھڑی کے نورانی تاروں کے مانند پر سکوت فضا میں بکھر گئی۔

میں بستر پر سے اٹھا اور دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا

''دونوں دلہنیں ماشاءاللہ بڑی خوبصورت ہیں''

''چندے آفتاب، چندے ماہتاب''

غالباً دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں ان کے موضوع نے میری دلچسپی کو بڑھا دیا اور میں نے زیادہ غور سے سننا شروع کیا۔

''تلے والی ساڑھی میں نرگس کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔۔گورے گورے

گالوں پر بکھری ہوئی مقیش۔۔۔۔۔۔جی چاہتا تھا، بڑھ کر بلائیں لے لوں۔''

''بچاری سمٹی جا رہی تھی''

''سر تو اٹھایا ہی نہیں اس نے۔۔۔۔۔۔پر۔۔''

''پر یہ شرم و حیا کب تک رہے گی۔۔۔آج رات۔۔۔''

''آج رات۔۔۔۔''

''اوئی اللہ۔۔۔۔۔تو کیسی باتیں کر رہی ہے شوشو'' اس کے ساتھ ہی کپڑے کی سرسراہٹ سنائی دی میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔۔۔شوشو۔۔۔تو ان میں سے ایک سوشیلا تھی میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی اور میں نے دروازے میں کوئی دراڑ تلاش کرنا شروع کر دی کہ ان کی گفتگو سننے کے ساتھ ساتھ ان کو دیکھ بھی سکوں ایک کواڑ کے نچلے تختے سے چھوٹی سی گانٹھ نکل گئی تھی اور اس طرح چونی کے برابر سوراخ پیدا ہو گیا تھا گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں نے آنکھ جما دی۔

شوشو قالین پر بیٹھی بسکٹی رنگ کی ساڑھی سے اپنی ننگی پنڈلی کو ڈھانک رہی تھی اس کے پاس ہی عفت شرمائی ہوئی سی گاؤ تکیے پر دونوں کہنیاں ٹیکے لیٹی تھی۔

''اس وقت ان گوری چٹی دلہنوں پر کیا بیت رہی ہو گی؟'' شوشو یہ کہہ کر رک گئی اور اپنی آواز دبا کر اس نے عفت کی چوڑیوں کو چھیڑ کر ان میں کھنکھناہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا ''ذرا سوچو تو؟''

عفت کے گال ایک لمحے کے لیے تھرتھرائے ''کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو شوشو''

''جی ہاں۔۔۔۔۔گویا ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں میری بنو کو بس میں ہو تو

ابھی سے اپنی شادی رچالو"

عفت نے سوشیلا کی بات کاٹ دی "پر یہ دلہنوں کو کہاں لے گئے ہیں شوشو؟"

"کہاں لے گئے ہیں؟" شوشو مسکرائی "سمندر کی تہہ میں جہاں جل پریوں کا راج ہے۔۔۔کوہ قاف کے غاروں میں جہاں سینگوں والے جنگ رہتے ہیں"

چند لمحات کے لیے ایک پر اسرار سکوت طاری رہا اس کے بعد شوشو پھر بولی "کہاں لے گئے ہیں؟۔۔۔۔۔لے گئے ہوں گے اپنے اپنے کمروں میں"

"بے چاریوں کو نیند کیسے آئے گی؟" ایک لڑکی جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی اور جس کا نام میں نہیں جانتا تھا اپنا اندیشہ بیان کیا۔

شوشو کہنے لگی "بے چاریاں۔۔۔۔۔کوئی ذرا ان کے دل سے جا کر پوچھے کہ ان کی آنکھیں اس رت جگے کے لیے کتنی بے قرار تھیں"

"تو بہت خوش ہوں گی؟"

"اور کیا؟"

"پر میں نے سنا ہے کہ یہ لوگ بہت ستایا کرتے ہیں؟" عفت سوشیلا کے پاس سرک آئی

"میں پوچھتی ہوں تمہیں اندیشہ کس بات کا ہو رہا ہے؟۔۔۔۔۔جب تمہارے وہ ستانے لگیں گے تو نہ ستانے دینا انہیں۔۔۔۔۔ہاتھ پیر باندھ دینا ان کے۔۔۔۔۔ابھی سے فکر میں کیوں گھلی جا رہی ہو"

"ہائیں ہائیں" عفت نے تیزی سے کہا "تم کیسی باتیں کر رہی ہو شوشو، دیکھو میرا دل کتنے زور سے دھڑکنے لگا ہے؟" عفت نے سوشیلا کا ہاتھ اٹھا کر اپنے دل

کے مقام پر رکھ دیا۔ ''کیوں؟''

شوشو نے عفت کے دل کی دھڑکنیں غور سے سنیں اور بڑے پر اسرار لہجے میں کہا ''جانتی ہو کیا کہہ رہا ہے؟''

عفت نے جواب دیا ''نہیں تو؟''

''یہ کہتا ہے عفت بانو غزنوی دلہن بننا چاہتی ہے''

''ہٹاؤ جی۔۔۔لاج تو نہیں آتی تمہیں'' عفت نے مسکرا کر کروٹ بدلی ''دل اپنا چاہتا ہے تمہارا اور خواہ مخواہ یہ سب کچھ میرے سر منڈھ رہی ہو'' پھر یکا یک اٹھ کھڑی ہوئی اور سوشیلا سے پوچھنے لگی ''ہاں۔۔۔۔۔یہ تو بتاؤ شوشو! تم بھلا کیسے آدمی سے شادی کرنا پسند کرو گی؟ میرے سر کی قسم! سچ سچ بتاؤ، مجھی کو ہائے ہائے کرو اگر جھوٹ بولو''

''میں کیوں بتاؤں'' یہ کہہ کر سوشیلا نے تیزی سے اپنے سر کو حرکت دی اور اس کا چہرہ نگاہوں سے پوشیدہ تھا سامنے آ گیا، میں نے غور سے دیکھا وہ مجھے بے حد حسین معلوم ہوئی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے سر کے چند پریشان بال برقی روشنی سے منور فضا میں ناچ رہے تھے چہرے کا گندمی رنگ نکھرا ہوا تھا اور سینہ جس پر سے ساڑھی کا پلو نیچے ڈھلک رہا تھا ہولے ہولے دھڑک رہا تھا چوڑے ماتھے پر سرخ بندیا بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔

عفت نے اصرار کیا ''تمہیں میرے سر کی قسم بتاؤ''

شوشو نے کہا ''پہلے تم بتاؤ''

''تو سنو۔۔۔۔۔۔مگر کسی سے کہو گی تو نہیں'' یہ کہہ کر عفت کچھ شرما سی گئی'' میں چاہتی ہوں۔۔۔میں چاہتی ہوں کہ میری شادی ایک ایسے نوجوان سے ہو۔۔۔۔ایسے۔۔۔۔۔''

شوشو بولی ''توبہ اب کہہ بھی دو''

عفت نے پیشانی پر سے بال ہٹائے اور کہا ''ہاں۔۔۔۔۔ایسے نوجوان سے ہو جس کا قد لمبا ہو جسم بڑے بھائی کی طرح سڈول ہو انگلینڈ ریٹرنڈ ہو انگریزی فر فر بولتا ہو۔۔۔۔رنگ گورا اور نقش تیکھے ہوں موٹر چلانا جانتا ہو اور بیڈمنٹن بھی کھیلتا ہو''

شوشو نے پوچھا ''بس کہہ چکیں؟''

''ہاں۔۔۔۔'' عفت نے نیم وا لبوں سے سوشیلا کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا

''میری دعا ہے کہ پرماتما تمہیں ایسا ہی پتی عطا فرمائیں'' سوشیلا کا چہرہ بڑا سنجیدہ تھا اور لہجہ ایسا تھا جیسے مندر میں کوئی مقدس منتر پڑھ رہی ہے۔

وہ لڑکی جو اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیتی تھی بولی ''عفت! اب شوشو کی باری ہے''

عفت جو شوشو کی ساڑھی کا ایک کنارہ پکڑ کر اپنی انگلی کے گرد لپیٹ رہی تھی کہنے لگی ''بھئی اب تم بتاؤ ہم نے تو اپنے دل کی بات تم سے کہہ دی۔''

شوشو نے جواب دیا ''دن کے کیا کرو گی؟۔۔۔۔۔میرے خیالات تم سے بالکل مختلف ہیں۔''

''مختلف ہوں یا ملتے ہوں، پر ہم سے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔''

''میں۔۔۔۔۔۔'' سوشیلا نے چھت کی طرف دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی ''میں۔۔۔۔ پر تم مذاق اڑاؤ گی عفت!''

''ارے۔۔۔۔۔ تم سناؤ تو؟''

سوشیلا نے ایک آہ بھری'' میرے سپنے عجیب و غریب ہیں عفت۔۔۔۔۔۔۔ یہ میرے دماغ میں صابن کے رنگ برنگے بلبلوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے ناچ کر غائب ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ میں سوچتی ہوں۔۔۔۔۔ اور پھر سوچتی ہوں کہ میں کیوں سوچا کرتی ہوں انسان جو کچھ چاہتا ہے اگر ہو جایا کرے تو کتنی اچھی بات ہے۔۔۔۔ لیکن پھر زندگی میں کیا رہ جائے گی۔۔۔۔۔۔ خواہشیں اور تمنائیں کہاں سے پیدا ہوں گی۔۔۔۔ ہم جس طرح جی رہے ہیں ٹھیک ہے جانتی ہوں کہ جو کچھ مانگ رہی ہوں نہیں ملے گا مگر دل میں مانگ تو رہے گی کیا زندہ رہنے کے لیے یہی کافی نہیں؟''

عفت اور دوسری لڑکی خاموش بیٹھی تھیں

شوشو نے پھر کہنا شروع کیا'' میں اپنا جیون ساتھی ایک ایسے نوجوان کو بنانا چاہتی ہوں جو صرف عمر کے لحاظ سے ہی جوان نہ ہو بلکہ اس کا دل، اس کا دماغ۔۔۔۔۔ اس کا رواں رواں جوان ہو۔۔۔۔۔ وہ شاعر ہو۔۔۔۔۔ میں شکل وصورت کی قائل نہیں۔۔۔۔۔۔ مجھے شاعر چاہیے جو میری محبت میں گرفتار ہو کہ سرتاپا محبت بن جائے جس کو میری ہر بات میں حسن نظر آئے۔۔۔۔۔۔ جس

کے ہر شعر میں میری اور صرف میری تصویر ہو۔۔۔۔۔جو میری محبت کی گہرائیوں میں گم ہو جائے میں اسے ان تمام چیزوں کے بدلے میں اپنی نسوانیت کا وہ تحفہ دوں گی جو آج تک کوئی عورت نہ دے سکی۔''

وہ خاموش ہو گئی عفت حیرت کے مارے اس کا منہ تکنے لگی اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوشیلا کی گفتگو کا کوئی مطلب نہیں سمجھ سکی میں خود متحیر تھا کہ پندرہ سولہ برس کی اس دبلی پتلی لڑکی کے سینے میں کیسے کیسے خیالات کروٹیں لے رہے ہیں اس کا ایک ایک لفظ میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔

''اگر وہ مجھے نظر آ جائے'' یہ کہہ کر سوشیلا آگے بڑھی اور عفت کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی ''تو میں اس کے استقبال کے لیے بڑھوں اور اس کے ہونٹوں پر وہ بوسہ دوں جو ایک زمانے سے میرے ہونٹوں کے نیچے جل رہا ہے۔''

اور شوشو نے عفت کے حیرت سے کھلے ہوئے ہونٹوں پر ہونٹ جما دیئے۔۔۔۔۔اور دیر تک ان کو جمائے رکھا تعجب ہے کہ عفت بالکل ساکت بیٹھی رہی اور معترض نہ ہوئی۔

جب دونوں کے لب ایک مدھم آواز کے ساتھ جدا ہوئے اور ان کے چہرے مجھے نظر آئے تو ایک عجیب وغریب نظارہ دیکھنے میں آیا جس کو الفاظ بیان ہی نہیں کر سکتے عفت اس شہد کی مکھی کی طرح مسرور و متعجب معلوم ہوتی تھی جس نے پہلی مرتبہ پھول کی نازک پتیوں میں بیٹھ کر اس کا رس چوسنے کی لذت محسوس کی ہو۔۔۔۔اور سوشیلا۔۔۔۔۔وہ اور زیادہ پر اسرار ہو گئی تھی۔

''آداب سوئیں''

یہ خواب آلود اور دھیمی آواز عفت کی تھی اس کے ساتھ ہی کپڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دی اور میں خیالات کے گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا۔

گندمی رنگ کی ننھی سی گڑیا، اپنے چھوٹے سے دماغ میں کیسے کیسے انوکھے خیالات کی پرورش کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔اور وہ کون سا تحفہ اپنے دامن نسوانیت میں چھپائے بیٹھی تھی جو آج تک کوئی عورت مرد کو پیش نہیں کر سکی؟

میں نے سوراخ میں سے دیکھے شوشو اور عفت دونوں ایک دوسری کے گلے میں باہیں ڈالی سو رہی تھیں شوشو کے چہرے پر بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے سانس سے ان میں خفیف سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا وہ کس قدر تر و تازہ معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔۔۔واقعی وہ اس قابل تھی کہ اس پر شعر کہے جائیں۔۔۔۔۔۔۔لیکن عباس تو شاعر نہیں تھا؟ پھر۔۔۔۔۔پھر۔۔۔۔

☆☆☆☆☆☆

شہ نشین پر

وہ سفید سلمہ لگی ساڑھی میں شہ نشین پر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے نقرئی تاروں والا انار چھوڑ دیا ہے ساڑھی کے تھرکتے ہوئے ریشمی کپڑے پر جب جگہ جگہ سلمہ کا کام ٹمٹمانے لگتا تو مجھے اپنا جسم پر وہ ٹمٹماہٹیں گدگدی کرتی محسوس ہوتیں۔۔۔۔۔وہ خود ایک عرصہ سے میرے لیے گدگدی بنی ہوئی تھی۔

میں اس کو تقریباً دوسو مرتبہ دیکھ چکا ہوں اور ان تمام درشنوں کے نقوش علیحدہ علیحدہ میرے دل و دماغ میں مرتسم ہیں ایک بار میں نے اسے صحن میں تیتری کے پیچھے دوڑتے دیکھا تھا ایک لمحے کے لیے وہ میری نگاہوں کے سامنے آئی اور گزر گئی اور جب کبھی میں اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے دل میں ایک ایسے پرندے کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے جو ڈر کر ایکا ایکی اڑ جائے اسی طرح ایک روز میں نے اسے اسی شہ نشین پر دھوپ میں اپنے گیلے بال جھٹکتے دیکھا تھا اور اب میں جس وقت اس تصویر کو اپنے ذہن کے پردے پر کھینچتا ہوں تو مجھے کبھی سیاہی نظر آتی ہے اور کبھی اجالا۔

میں اس کو اتنا دیکھ چکا ہوں کہ اب میں اس کے سامنے آئے بغیر اسے جب چاہوں دیکھ سکتا ہوں پہلے پہل مجھے اس کام میں دقت محسوس ہوئی تھی مگر اب کوئی مشکل پیش نہیں آئی ابھی کل شام کو جب مجھے ایک دوست کے یہاں بیٹھے بیٹھے اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تو میں نے آنکھیں بند کیے بغیر اسے اپنے سامنے لا کھڑا تھا۔ وہ ہو بہو ویسی تھی جیسی کہ وہ ہے اور اس بات کا نہ میرے دوست کو پتہ

چلا اور نہ اس کی بہن کو جو میرے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی میں نے ایک لمحے کے لیے اسے اپنے ذہن کی ڈبیا میں سے نکال کر دیکھا اور فوراً ہی وہیں بند کر دیا کسی کو معلوم تک نہ ہوا کہ میں نے کیا کر دیا ہے اس کو دیکھنے کے بعد میں نے یوں سلسلہ کلام شروع کیا گویا میرا ذہن ایک لمحے کے لئے بھی غیر حاضر نہ ہوا تھا "جی ہاں سوکھی ہوئی مچھلیوں سے سخت بو آتی ہے نہ جانے یہ لوگ انہیں کھاتے کس طرح ہیں میری تو ناک۔۔۔" اور اس کے بعد مختلف قسم کی ناکوں پر گفتگو شروع ہو گئی تھی۔

اس کی ناک مجھے بہت پسند ہے میرے پاس ہلکے گلابی رنگ کا ٹی سیٹ ہے جو مجھے صرف اس لیے عزیز ہے کہ اس کی پیالیوں کی دستی اس کی ناک سے ملتی جلتی ہے آپ ہنسیں گے مگر ایک روز صبح کو جب میں نے اسے قریب سے دیکھا تو میرے دل میں عجیب و غریب خواہش پیدا ہوئی کہ اس کی ناک پکڑ کر اس کے ہونٹوں کا رس پی لوں۔

اس کے ہونٹ مجھے پیارے لگتے تھے شاید اس لیے کہ وہ ہر وقت نم آلود رہتے تھے یہ نمی ان میں سنگترے کی لڑیوں کی مانند چمک پیدا کر دیتی تھی ان کے چومنے کی خواہش اگر میرے دل میں پیدا ہوئی تھی تو اس کا باعث یہ نہ تھا کہ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور لوگوں سے سنا تھا کہ عورتوں کے ہونٹ چومے جاتے ہیں، نہیں۔۔۔۔۔۔ اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا تو بھی میرے دل میں ان کو چومنے کی خواہش پیدا ہوتی اس کے ہونٹ ہی کچھ اس قسم کے تھے کہ وہ ایک نامکمل بوسہ معلوم ہوتے تھے۔

وہ میرے ہمسائے ڈاکٹر کی اکلوتی بیٹی تھی سارا دن وہ نیچے اپنے باپ کی

ڈسپنسری میں بیٹھی رہتی کبھی کبھی جب میں اسے بازار سے گزرتے ہوئے شیشوں میں دوائیوں کی الماری کے پاس کھڑی دیکھتا تو مجھے وہ ایک لمبی گردن والی بوتل دکھائی دیتی جس میں کوئی خوش رنگ سیال مادہ ابل رہا ہو ایک روز میں ڈسپنسری میں ڈاکٹر صاحب سے دوا لینے کے لیے گیا مجھے زکام کی شکایت تھی ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا "بیٹا ان کے رومال پر یوکلپٹس آئل کے چند قطرے ٹپکا دو۔"

اس نے میرا رومال لیا اور الماری میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر دوا کے قطرے ٹپکانے لگی۔ اس وقت میرے جی میں آئی کہ اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لوں اور کہوں اس شیشی کو بند کر دیجئے اگر آپ اپنی آنکھوں کا ایک آنسو مجھے عنایت فرما دیں تو میری بہت سی بیماریاں دور ہو جائیں لیکن میں خاموش بیٹھا دوا کے ان سفید قطروں کی طرف دیکھتا رہا جو میرے رومال میں جذب ہو رہے تھے۔

جب سے میں نے اسے دیکھنا شروع کیا ہے میری دلی خواہش رہی ہے کہ وہ روئے اور میں اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھوں۔ میں نے تصور میں کئی مرتبہ اس کی آنکھوں کو غمناک دیکھا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میں اسے سچ مچ روتا دیکھنا چاہتا ہوں اس کی گھنی پلکوں میں پھنسے ہوئے آنسو بہت اچھے معلوم ہوں گے چق پر سے جب بارش کے قطرے رک رک کر نیچے پھسل رہے ہوں تو کتنے دلفریب دکھائی دیا کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ عورت کی آنکھوں میں آپ آنسو ضروری خیال نہ کریں پر میں آنسوؤں کو ہٹا کر عورت کی آنکھوں کا تصور ہی نہیں کر سکتا آنسو آنکھوں کا پسینہ ہے مزدور کی پیشانی صرف اسی صورت میں مزدور کی پیشانی ہو سکتی ہے جب اس پر

پسینے کے قطرے چمک رہے ہوں اور عورت کی آنکھ صرف اسی صورت میں عورت کی آنکھیں ہو سکتی ہیں جب آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہوں۔

وہ سفید سلمہ لگی ساڑھی میں شہ نشین پر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے نقرئی تاروں والا انار چھوڑ دیا ہے ساڑھی کے تھرکتے ہوئے ریشمی کپڑے پر جگہ جگہ سلمے کا کام ٹمٹما رہا تھا اور مجھے اپنے جسم پر گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی اس نے ایکا ایکی پلٹ کر میری طرف دیکھا گویا اس کو فوراً ہی اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے علاوہ رات کی خاموشی میں کوٹھے پر کوئی اور متنفس بھی ہے۔۔۔اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔۔اس کی آنکھیں دو موتی رول رہی تھیں۔۔۔۔وہ رو رہی تھی وہ۔۔۔۔وہ رو رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔میرے دیکھتے ہی دیکھتے اور قبل اس کے کہ میں کچھ کر سکوں، اس کی آنکھوں سے اس کے شباب کے پہلے پسینے کے قطرے چھلکے اور سنگین فرش پر پھیل گئے وہ میری خلل انداز نگاہوں کی تاب نہ لا سکے وہ دراصل چپ چاپ دوسروں کو خبر کیے بغیر نوزائیدہ بچوں کی مانند تھوڑی دیر ان دو نرم و نازک پنگھوروں میں لیٹے رہنا چاہتے تھے، مگر میری نگاہوں کے شور سے وہ مچل گئے وہ رو رہی تھی پر میں خوش تھا اس کی نم آلود آنکھیں کہرے میں لپٹی ہوئی جھیلیں معلوم ہوتی تھیں بڑی پراسرار، بڑی فکر خیز، پانی کی پتلی سی تہہ کے نیچے اس کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی، ان ننھی ننھی مچھلیوں کی مانند جھلملا رہی تھی جو پانی کے اوپر آنے سے ڈرتی ہوں۔

میں نے اس کو دیکھنا چھوڑ کر اس کی آنکھوں کو دیکھنا شروع کر دیا جس طرح دسمبر کی سرد اور گیلی رات میں کھلی فضا کے اندر دو دیئے جل رہے ہوں اس کی

آنکھیں دور سے بہت دور سے مجھے دیکھتی رہیں میں نے ان کی طرف بڑھنا شروع کیا۔۔۔۔دو آنسو بنے گھنی پلکوں میں تھوڑی دیر پھنسے رہے پھر آہستہ آہستہ اس کے زرد گالوں پر ڈھلک گئے داہنی آنکھ میں ایک آنسو بنا۔باہر نکلا۔۔۔۔گال کی ہڈی پر تھوڑی دیر کے لیے اس مسافر کی طرح جس کی منزل بالکل قریب ہو ایک لمحے کے لیے سستایا اور پھسل کر تیزی سے اس کے لبوں کے ایک گوشے کے قریب سے ہو کر آگے دوڑنے والا ہی تھا کہ ہونٹوں کی نمی نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ ایک پتلی سی دھار بن کر پھیل گیا دھلی ہوئی آنکھوں سے اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پوچھا ''تم کون ہو؟''

وہ جانتی تھی کہ میں کون ہوں اور یہ پوچھتے ہوئے کہ میں کون ہوں وہ میرے بارے میں کچھ دریافت نہ کر رہی تھی بلکہ وہ پوچھ رہی تھی کہ وہ خود کون ہے میں نے جواب دیا ''تم شیلا ہو؟''

اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ ایک خفیف ارتعاش کے ساتھ کھلے اور سسکیوں میں کہنے لگی ''شیلا۔۔۔۔۔شیلا۔۔۔۔شی'' وہ شہ نشین پر بیٹھ گئی وہ تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن ایکا ایکی اسے کچھ خیال آیا اور جو خواب وہ دیکھ رہی تھی اسے اپنے دماغ سے جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔۔۔'' میں۔۔۔۔میں کیا کہہ رہی تھی؟۔۔۔۔مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔۔میں اچھی ہوں۔۔۔۔۔۔اور میں یہاں کیسے چلی آئی؟''

میں نے اسے بڑے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''گھبراؤ نہیں شیلا۔۔۔۔۔تم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔۔۔۔۔ایسی باتیں نہ کہی جاتی ہیں اور نہ سنی جاتی ہیں''

شیلا نے اس انداز سے میری جانب دیکھا گویا میں نے اس کو کوئی چوری پکڑ لی ہے "کیسی باتیں؟۔۔۔۔۔کیسی باتیں؟۔۔۔۔کوئی بات بھی تو ہو"

میں نے اس سے کہا "پرسوں جب تم نیچے ڈسپنسری میں لال لال جیب نکال کر طوطے سے کھیل رہی تھیں اور تمہاری بلوریں انگلیاں بوتلوں سے ٹکرا کر ایک عجیب قسم کی جھنکار پیدا کر رہی تھی اس وقت تم ایک نامکمل عورت تھیں، پر آج جب کہ تمہاری آنکھیں رو رہی ہیں تم مکمل عورت بن گئی ہو کیا تمہیں یہ فرق محسوس نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے، ضرور ہوتا ہے، وہ چیز جو کل تھی آج تم میں نہیں ہے اور جو آج ہے کل نہ رہے گی پر وہ داغ جو مسرت کا گرم لوہا تمہارے دل پر لگا گیا ہے ہمیشہ ویسے کا ویسا رہے گا۔۔۔۔۔یہ کتنی اچھی بات ہے۔۔۔۔تمہاری زندگی میں ایک ایسی چیز تو ہو گی جو ساری کی ساری تمہاری ہو گی۔۔۔۔ایک ایسی چیز جس کی ملکیت پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا کاش میرا دل تمہارا دل ہوتا۔۔۔۔کسی عورت کا دل ہوتا۔۔۔۔جو ایک ہی داغ کو کافی سمجھتا ہے۔۔۔۔عورت کے دل کی آبادی میں کئی ویرانے سما سکتے ہیں۔۔۔۔ویرانوں کا یہ ہجوم بجائے خود ایک آبادی ہے۔۔۔تم خوش قسمت ہو۔۔۔۔وہ دن جس کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑتا تم نے بہت جلد دیکھ لیا۔۔۔۔تم خوش قسمت ہو"

وہ میری طرف اس مرغی کی طرح حیرت سے دیکھنے لگی جس نے پہلی بار انڈا دیا ہو وہ اپنے کو ٹٹولنے لگی "خوش قسمت!۔۔۔۔میں خوش قسمت۔۔۔۔وہ کیسے؟۔۔۔۔آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے جواب دیا "جب پتنگ کٹ جائے اور کوٹھوں پر چڑھے ہوئے

لونڈے ڈور لوٹنے کے لئے شور مچانا شروع کر دیں تو کسی کے بتانے کی حاجت نہیں رہتی ۔۔۔۔ کہ پتنگ کٹ گیا ہے ۔۔۔۔۔۔ جو پتنگ تم نے ہوا کی بلندیوں میں اڑایا تھا کہاں ہے؟ ۔۔۔ کل تک اس کی ڈور تمہارے ہاتھ میں تھی، پر آج نظر نہیں آتی۔"

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے

"میں خوش قسمت ہوں" آنسوؤں میں بھیگے ہوئے لفظ اس کے منہ سے نکلے "میں خوش قسمت ہوں ۔۔۔۔۔۔ آپ ان لونڈوں سے جو ڈور لوٹنے کے لئے کوٹھوں پر چڑھے رہتے ہیں کم شور نہیں مچا رہے۔"

آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے اس نے میری طرف اس بارش میں سے دیکھا اور کہا "میری آنکھوں سے آنسو نکال کر آپ کس کا حلق تر کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔۔ میں سب جانتی ہوں یہ سوئیاں آپ مجھے کیوں چبھو رہے ہیں۔"

اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اس کی عقل اس وقت اس چاقو کے پھل کی مانند تھی جسے ضرورت سے زیادہ سان پر لگایا گیا ہو۔

میں نے اس سے بڑے اطمینان سے کہا "جو کچھ ہو چکا ہے اس کا مجھے علم ہے اور اگر اس وقت میں تم سے یہ سب کچھ بھول جانے کے لیے کہتا تم سے مصنوعی الفاظ میں ہمدردی کرتا مداریوں کے مانند ایک ہاتھ میں تمہارا سارا غم لے کر چھومنتر کے ذریعے سے غائب کر دیتا تو تم یقیناً مجھے اپنا دوست مانتیں، پر میں ایسا نہیں کر سکتا ۔۔۔۔۔ دل تمہارا ہے اور جو اس پر گزرا ہے وہ بھی تمہارا ہے، میں کیوں تمہارے دل کو دولت سے محروم کروں، کیوں تمہیں اس درد کو بھول جانے کے لئے

کہوں جو تمہارا سرمایہ حیات ہے۔ اس درد پر، اسی دکھ دینے والے واقعہ پر جو بیت چکا ہے تمہیں اپنی زندگی کے آنے والے دنوں کی بنیادیں استوار کرنا ہوں گی۔۔۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا شیلا، پر اگر تم چاہتی ہو تو تمہاری تسکین کے لیے میں یہ بھی کر سکتا ہوں بولو میں کیا کہوں؟''

یہ سن کر اس نے تیزی سے کہا ''مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں؟''

''میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ ایسے حالات میں کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔۔۔۔۔ آگ کے اندر کودنے والے کھیل میں ہدایت دینے والے کی کیا ضرورت؟۔۔۔۔ پریم کی ارتھی کو دوسرے کے کاندھوں سے کیا سروکار، یہ لاش تو زندگی بھر ہمیں اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرنا ہوگی۔۔۔''

وہ بیچ میں بول اٹھی'' اٹھاؤں گی۔۔۔۔۔۔ آپ کو اس بات سے کیا۔۔۔ ایسی ایسی بھیانک باتیں سنا کر آپ مجھے کس لیے ڈرانا چاہتے ہیں۔۔۔۔ میں نے اس سے محبت کی۔۔۔ اور کیا میں اب بھی اس سے محبت نہیں کرتی۔۔۔۔ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میرے ساتھ فریب کیا ہے پر یہ فریب، یہ دھوکا بھی تو اسی نے دیا ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں۔۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ اس نے میری زندگی برباد کر دی ہے مجھے کہیں کا نہیں رکھا لیکن پھر کیا ہوا۔۔۔۔ میں ایک بازی کھیلی اور ہار گئی۔۔۔۔۔ آپ مجھے ڈرانا چاہتے ہیں مجھے طعنے دینا چاہتے ہیں۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔۔ جسے اب موت تک کی پروا نہیں رہی۔۔۔۔۔ میں نے موت کا نام لیا ہے اور۔۔۔۔۔۔ اور دیکھئے آپ کے بدن پر کپکپی دوڑ گئی ہے، آپ موت سے ڈرتے ہیں مگر میری

طرف دیکھئے، میں موت سے نہیں ڈرتی۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا اس کے لبوں پر ایک زبردستی کی مسکراہٹ ناچ رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی پتلی تہہ کے نیچے ایک عجیب قسم کی روشنی جھلملا رہی تھی اور وہ خود کانپ رہی تھی ہولے ہولے۔

میں نے اس کو دوبارہ غور سے دیکھا اور کہا "میں موت سے ڈرتا ہوں اس لیے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں تم موت سے نہیں ڈرتی، اس لیے کہ تمہیں زندہ رہنا نہیں آتا جو شخص زندہ رہنے کا سلیقہ نہیں جانتا اس کے لیے زندہ رہنا بھی موت کے برابر ہے۔۔۔۔ اگر تم مرنا چاہتی ہو تو بڑے شوق سے مر جاؤ"

وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی میں نے کہنا شروع کیا "تم مرنا چاہتی ہو اس لیے کہ تم سمجھتی ہو کہ دکھ کے اس پہاڑ کا بوجھ جو ایکا ایکی تم پر ٹوٹ پڑا ہے تم سے نہ اٹھایا جائے گا۔۔۔۔ یہ غلط ہے۔۔۔۔ جب تم محبت کرنے کی طاقت رکھتی ہو، تو اس کی شکست کے صدمے برداشت کرنے کی بھی قوت رکھتی ہو۔۔۔۔۔۔ وہ لذت، وہ حظ، وہ مسرت جو تم نے اس سے محبت کر کے حاصل کی، تمہاری زندگی کا عرق ہے اسے سنبھال کر رکھو اور باقی تمام عمر ان چند گھنٹوں پر بسر کرو۔۔۔۔۔ وہ مرد جس سے تم نے محبت کی، اتنا ضروری، اتنا اہم نہیں ہے، جتنی کہ تمہاری محبت ہے، جو اس سے تم کو ہے۔۔۔۔۔ اس مرد کو بھول جاؤ لیکن اپنی محبت کو یاد رکھو اس کی یاد پر جبکہ۔۔۔ ان لمحات کی یاد پر جن کو حاصل کرنے کے لیے تم نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے توڑ ڈالی۔۔۔۔ کیا تم ان لمحات کو بھول سکتی ہو، جس کی قیمت میں تم نے ایک بیش بہا موتی دیا ہے۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ مرد

ایسے لمحات کو بھول سکتا ہے بھول جاتا ہے اس لیے کہ اسے کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی۔۔۔۔۔۔ پر عورتیں نہیں بھول سکتیں، جنہیں چند گھڑیوں کی فرصت کے لیے اپنی ساری زندگی چکنا چور کر دینا پڑتی ہے۔۔۔۔ تم مرنا چاہتی ہو۔۔۔۔ کیا تم اس سرائے میں اتنے مہنگے داموں پر کمرہ اٹھا کر بھی اس کو چھوڑ دینا چاہتی ہو۔۔۔۔ زندہ رہو نہیں نہیں اس زندگی کو استعمال کرو ہمیں مرنا ضرور ہے اسی لیے تو زندہ رہنا بھی ضروری ہے۔"

میری باتوں نے اس پر تکان سی طاری کر دی وہ نڈھال ہو کر شہ نشین پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی "میں تھک گئی ہوں۔۔۔۔"

"جاؤ، سو جاؤ۔۔۔۔۔ آرام کرو اور دوسری مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خود میں ہمت پیدا کرو۔۔۔۔" یہ کہہ کر میں چلنے ہی کو تھا کہ مجھے دفعتاً ایک خیال آیا اور اس خیال کے آتے ہی تھوڑی دیر کے لیے میرا دل بیٹھ سا گیا۔ میں نے سوچا اگر اس نے اپنے آپ کو مار لیا تو۔۔۔۔ اور یہ سوچتے ہوئے مجھے یہ خدشہ پیدا ہوا کہ مجھ میں ایک چیز کی کمی ہو جائے گی چنانچہ میں پلٹا اور اس کے قریب جا کر اس سے التجائیہ لہجے میں کہا "شیلا! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔۔۔"

شیلا نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا

"دیکھو شیلا! میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ خودکشی کے خیال سے باز آ جاؤ۔۔۔۔ تم زندہ رہو، ضرور زندہ رہو"

اس نے میری بات سنی اور پوچھا "کیوں؟"

"کیوں؟۔۔۔۔۔ یہ تم مجھ سے کیوں پوچھتی ہو شیلا! تمہارا دل اچھی طرح

جانتا ہے کہ میں تم سے یہ التجا کیوں کر رہا ہوں۔۔۔چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔۔مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے اور نہ مجھے اپنے آپ سے کوئی شکایت ہے۔۔۔۔بات یہ ہے کہ میں نے جو چیز شروع کی تھی اب اسے اختتام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔میں خود غرض کیوں۔۔۔۔ہر انسان خود غرض ہے۔۔۔۔ میں تم سے التجا کر رہا ہوں کہ تم نہ مرو، جیو۔۔۔۔۔یہ خود غرضی ہے۔۔۔۔تم زندہ رہو گی تو میری محبت جوان رہے گی۔۔۔۔۔تمہاری زندگی کے ہر دور کے ساتھ میں اپنی محبت کو وابستہ دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔پر تمہاری اجازت سے"

وہ دیر تک سوچتی رہی وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا "مجھے زندہ رہنا ہو گا"

اس کے دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے اس تھکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں نیچے اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

قاسم

باورچی خانہ کی مٹ میلی فضا میں بجلی کا اندھا سا بلب کمزور روشنی پھیلا رہا تھا سٹوو پر پانی سے بھری ہوئی کیتلی دھری تھی پانی کا کھولاؤ اور سٹوو کے حلق سے نکلتے ہوئے شعلے مل جل کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں راکھ میں سوگئی تھیں دور کونے میں قاسم گیارہ برس کا لڑکا برتن مانجھنے میں مصروف تھا یہ ریلوے انسپکٹر صاحب کا بوائے تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا یہ الفاظ ایسے تھے جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکلے رہے تھے

''جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!''

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انہیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیے بغیر آرام۔۔۔۔ یہ کیوں کر ممکن تھا۔

سٹوو بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اگل رہا تھا کیتلی کا پانی اسی انداز میں کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابل مغلوب حملے کو محسوس کر کے اپنے جسم کو ایک جنبش دی اور ''جی آیا صاحب!'' گنگناتا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

دیوار گیروں پر چنے ہوئے برتن سوئے ہوئے تھے پانی کے نل سے پانی کی بوندیں نیچے میلی سل پر ٹپک رہی تھیں اور اداس آواز پیدا کر رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا

تھا کہ فضا پر غنودگی سی طاری ہے دفعتاً آواز بلند ہوئی

''قاسم۔۔۔۔قاسم!''

''جی آیا صاحب!'' لڑکا جو انہی الفاظ کی گردان کر رہا تھا بھاگا بھاگا اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے گرج کر کہا ''بیوقوف کے بچے آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔''

''ابھی لایا صاحب۔۔۔۔ابھی لایا صاحب!''

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اسی کمرے سے آواز آئی

''قاسم۔۔۔۔قاسم!''

''جی آیا صاحب!'' قاسم بھاگتا ہوا پھر اپنے آقا کے پاس گیا

''بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ بس بھاگے جاؤ سخت پیاس لگ رہی ہے''

''بہت اچھا صاحب!''

قاسم بھاگا بھاگا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے قریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔

''اب تم جاؤ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو؟ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟''

''ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!''

''برتن صاف کرنے کے بعد میرے دونوں کالے شو پالش کر دینا مگر دیکھنا

احتیاط رہے چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے ورنہ۔۔۔۔"

"قاسم کو "ورنہ" کا جملہ بخوبی معلوم تھا" بہت اچھا صاحب کہہ کر وہ باورچی خانے میں چلا گیا اور برتن صاف کرنے شروع کر دیئے۔

اب نیند اس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں سر میں پگھلا ہوا سیسہ اتر رہا تھا یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں قاسم نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا

"جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! بوٹ ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!"

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رکا اب اسے محسوس ہوا کہ نیند ضرور غلبہ پا کے رہے گی پر ابھی برتنوں کو دھو کر انہیں اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا جب اس نے یہ سوچا تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں آیا "بھاڑ میں جائیں برتن اور چولہے میں جائیں شو۔۔۔۔ کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ پر سو جاؤں اور پھر چند لمحہ آرام کرنے کے بعد۔۔۔"

اس خیال کو باغیانہ تصور کر کے قاسم نے ترک کر دیا اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آئی کہ ابلتا ہوا پانی سر پر انڈیل لے اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کے کام میں حارج ہو رہی تھی نجات پا جائے۔۔۔۔ مگر پانی اتنا گرم تھا کہ اس کے بھیجے تک کو پگھلا دیتا۔ چنانچہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار مار کر اس نے باقی ماندہ برتن

صاف کیے یہ کام کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا اب وہ آرام سے سو سکتا تھا اور نیند۔۔۔۔۔وہ نیند جس کے لیے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانے کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھا لیا اور لیٹ گیا اس سے پہلے کہ نیند اسے اپنے نرم نرم بازوؤں میں تھام لے اس کے کان ''شوشو'' کی آواز سے گونج اٹھے

''بہت اچھا صاحب! ابھی پالش کرتا ہوں'' قاسم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا

ابھی قاسم شو کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبے نے اسے وہیں سلا دیا۔

سورج کی لال لال کرنیں مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں مگر قاسم سویا رہا

جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں اپنے کالے جوتوں کے پاس سویا دیکھا تو اسے ٹھوکر مار کے جگاتے ہوئے کہا ''یہ سور کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے اور مجھے خیال تھا کہ اس نے شو صاف کر لیے ہوں گے۔۔۔۔۔نمک حرام!۔۔۔۔ابے قاسم''

''جی آیا صاحب!''

قاسم فوراً اٹھ بیٹھا ہاتھ میں جب اس نے پالش کرنے کا برش دیکھا اور رات کے اندھیرے کی بجائے دن کی روشنی دیکھی تو اس کی جان خطا ہو گئی۔

''میں سو گیا تھا صاحب! مگر۔۔۔۔۔مگر شو ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب!''

یہ کہہ کر اس نے جلدی جلدی پالش کرنا شروع کر دیا۔

پالش کرنے کے بعد اس نے اپنا بستر بند کیا اور اسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

''قاسم!''

''جی آیا صاحب!''

قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے اس لیے باورچی خانہ کے تمام برتن اچھی طرح صاف رکھنا فرش بھی دھلا ہوا ہونا چاہیے اس کے علاوہ تمہیں ڈرائنگ روم کی تصویریں، میزیں اور کرسیاں بھی صاف کرنا ہوں گی۔۔۔۔۔ سمجھے خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار والا چاقو ہے، اسے مت چھیڑنا میں اب دفتر جا رہا ہوں مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے پہلے ہو جائے۔''

''بہت بہتر صاحب!''

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد اس نے باورچی خانہ کا سارا کام ختم کر دیا اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھنچ گئی کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گرد برتن ہی برتن پڑے ہیں اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے ہوا زوروں پر چل رہی ہے جس سے وہ راکھ

اڑ اڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے یکا یک اس ظلمت میں ایک سرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں سرخ برچھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھس گئیں زمین خون سے شرابور ہو گئی۔

قاسم دہشت زدہ ہو گیا اور اس وحشت ناک تصور کو دماغ سے جھٹک کر ''جی آیا صاحب! جی آیا صاحب!'' کہتا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کے تصور میں ایک اور منظر رقص کرنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے دفعتاً آندھی چلنے لگی جس کے ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیانک دیو نمودار ہوا یہ دیوان سب لڑکوں کو نگل گیا قاسم نے خیال کیا کہ وہ دیو اس کے آقا کے ہم شکل تھا گو کہ قد و قامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا۔۔۔ قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کیا کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد وہ میز صاف کرنے کے لیے بڑھا تو اسے خیال آیا ''آج مہمان آ رہے ہیں خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنا پڑیں گے نیند کمبخت پھر ستائے گی مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔''

وہ یہ سوچ رہا تھا اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا اچانک اسے قلمدان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا۔۔۔۔ وہی چاقو جس کے متعلق اس کے آقا نے کہا تھا بہت تیز ہے، چاقو کا دیکھنا تھا کہ اس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو

گئے ''چاقو تیز دھار چاقو! یہی تمہاری مصیبت ختم کر سکتا ہے۔''

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا کے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔۔۔۔۔اب وہ شام کو برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا اور نیند۔۔۔۔۔پیاری نیند اسے با آسانی نصیب ہو سکتی تھی۔

انگلی سے خون کی سرخ دھار بہہ رہی تھی سامنے والی دوات کے سامنے روشنائی سے کہیں چمکیلی قاسم اس خون کی دھار کو مسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور منہ میں گنگنا رہا تھا ''نیند۔۔۔۔نیند۔۔۔۔۔۔پیاری نیند۔۔۔''

تھوڑی دیر بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنانخانہ میں بیٹھی سلائی رک رہی تھی اور اپنی انگلی دکھا کر کہنے لگی ''دیکھئے بی بی جی!''

''ارے قاسم! یہ تو نے کیا کیا؟ کمبخت، صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہو گا تو نے؟''

قاسم مسکرا دیا ''بی بی جی! بس میز صاف کر رہا تھا کہ اس نے کاٹ کھایا''

''سور اب ہنستا ہے، ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں پر اب یہ تو بتا کہ آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟''

قاسم اپنی فتح پر جی ہی جی میں بہت خوش ہوا۔

انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں چلا آیا میز پر سے خون کے دھبے صاف کرنے کے بعد اس نے خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا سامنے طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا اس کی طرف دیکھ کر قاسم نے مسرت بھرے لہجہ میں کہا ''اب اس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے اور ضرور صاف کرنے ہوں گے کیوں

میاں مٹھو؟''

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا انسپکٹر صاحب قاسم کی انگلی دیکھ کر بہت برسے اور جی کھول کر اسے گالیاں دیں مگر اسے مجبور نہ کر سکے۔۔۔۔شاید اس وجہ سے کہ ایک بار ان کی اپنی انگلی میں قلم تراش چبھ جانے پر بہت درد ہوا تھا۔

آقا کی خفگی آنے والی مسرت نے بھلا دی اور قاسم کودتا پھاندتا اپنے بستر پر جا لیٹا۔تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا مگر اس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا۔۔۔۔اب وہی مصیبت پھر نمودار ہو گئی۔

''قاسم۔۔۔۔۔۔صاحب کی جرابیں اور قمیض دھو ڈالو''

''بہت اچھا بی بی جی!''

''قاسم اس کمرے کا فرش کتنا میلا ہو رہا ہے پانی لا کر ابھی صاف کرو دیکھنا کوئی داغ دھبہ باقی نہ رہے۔''

''بہت اچھا صاحب!''

''قاسم شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں انہیں نمک سے بھی ابھی صاف کرو''

''ابھی کرتا ہوں بی بی جی!''

''قاسم! ابھی بھنگن آ رہی ہے تم پانی ڈالتے جانا وہ سیڑھیاں دھو ڈالے گی''

''بہت اچھا صاحب!''

''قاسم ذرا بھاگ کر ایک آنہ کا دہی تو لے آنا''

''ابھی چلا بی بی جی!''

پانچ چھ روز اس قسم کے احکام سننے میں گزر گئے قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آ گیا ہر روز اسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا پھر بھی علی الصبح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لیے چائے تیار کرنا پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لیے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اس کا ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھا اور ایک لمحہ کے بعد اس کی انگلی سے خون بہنے لگا انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی اس حرکت پر سخت خفا ہوئے چنانچہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا نہ دیا گیا مگر قاسم خوش تھا ''ایک وقت روٹی نہ ملی انگلی پر معمولی سا زخم آ گیا مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے تو نجات مل گئی یہ سودا کیا برا ہے۔''

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا اب پھر کام کی وہی بھر مار تھی پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گزر گئے اس عرصہ میں قاسم نے بارہا ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کر لے مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھا لیا گیا تھا اور باورچی خانے والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا اب قاسم کو ہر وقت باورچی خانے میں رہنا پڑا کبھی مرچیں پیستا، کبھی آٹا گوندھتا، کبھی کوئلے سلگاتا، غرض صبح سے لے کر شام تک اس کے کانوں میں ''ابے قاسم یہ کر! ابے قاسم وہ کر!'' کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا۔۔۔۔۔ قاسم کی ننھی سی جان اور ہمت جواب دے گئی مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب نے اسے الماری صاف کرنے کو کہا جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی تھیں الماری صاف کرتے وقت اسے ڈاڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا بلیڈ پکڑتے ہی اس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا دھار تھی بہت تیز انگلی میں دور تک چلی گئی جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔

قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون نکلنا بند ہو جائے مگر زخم کا منہ بڑا تھا سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہو گیا بھاگا ہوا انسپکٹر صاحب کی بیوی کے پاس گیا

''بی بی جی! میری انگلی میں صاحب کا استرا لگ گیا ہے''

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا تو فوراً معاملے کو سمجھ گئی چپ چاپ اٹھی اور کپڑا نکال کر اس کی انگلی پر باندھ دیا اور کہا'' قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔''

''کیوں بی بی جی!''

''یہ صاحب سے پوچھنا''

''صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور پیلا پڑ گیا۔''

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے لوٹے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سن کر اسے فوراً اپنے پاس بلایا۔

''کیوں میاں یہ انگلی ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی؟''

قاسم خاموش کھڑا رہا

''تم نوکر لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم اندھے ہیں اور ہمیں بار بار دھوکا دیا جا سکتا ہے

اپنا بوریا بستر دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ ہمیں تم جیسے نوکروں کی ضرورت نہیں ہے سمجھے۔"

"مگر۔۔۔۔۔مگر صاحب!"

"صاحب کا بچہ۔۔۔ بھاگ جا یہاں سے تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا"

قاسم کا افسوس نہ ہوا بلکہ اسے خوشی محسوس ہوئی کہ چلو کام سے کچھ دیر کے لیے چھٹی مل گئی گھر سے نکل کر وہ اپنی زخمی انگلی سے بے پروا سیدھا چوپاٹی پہنچا، اور وہاں ساحل کے پاس ایک بینچ پر لیٹ گیا اور خوب سویا۔

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم بد احتیاطی کے باعث سپٹک ہو گیا سارا ہاتھ سوج گیا جس دوست کے پاس وہ ٹھہرا تھا اس نے اپنی دانست کے مطابق اس کا بہتیرا علاج کیا مگر تکلیف بڑھتی گئی آخر قاسم خیراتی ہسپتال میں داخل ہو گیا جہاں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

اب جب کبھی قاسم اپنا کٹا ہوا ٹنڈ منڈ ہاتھ بڑھا کر فلورا فاؤنٹین کے پاس لوگوں سے بھیک مانگتا ہے تو اسے وہ بلیڈ یاد آ جاتا ہے جس نے اسے بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی اب وہ جس وقت چاہے سر کے نیچے اپنی گدڑی رکھ کر فٹ پاتھ پر سو سکتا ہے اس کے پاس ٹین کا ایک چھوٹا سا بھبکا ہے جس کو کبھی نہیں مانجھتا اس لیے کہ اسے انسپکٹر صاحب کے گھر کے وہ برتن یاد آ جاتے تھے جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

قبض

نئے لکھے ہوئے مکالمے کا کاغذ میرے ہاتھ میں تھا ایکٹر اور ڈائریکٹر کیمرے کے پاس سامنے کھڑے تھے شوٹنگ میں ابھی کچھ دیر تھی اس لیے کہ اسٹوڈیو کے ساتھ والا صابن کا کارخانہ چل رہا تھا ہر روز اس کارخانے کے شور کی بدولت ہمارے سیٹھ صاحب کا کافی نقصان ہوتا تھا کیونکہ شوٹنگ کے دوران جب ایکا ایکی اس کارخانے کی کوئی مشین چلنا شروع ہو جاتی تو کئی کئی ہزار فٹ فلم کا ٹکڑا بیکار ہو جاتا اور ہمیں نئے سرے سے کئی سینوں کی دوبارہ شوٹنگ کرنا پڑتی۔

ڈائریکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن کے درمیان کیمرے کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور میں ستانے کی خاطر کرسی پر ٹانگوں سمیت بیٹھا تھا وہ یوں کہ میری دونوں ٹانگیں کرسی کی نشست پر تھیں اور میرا بوجھ نشست کی بجائے ان پر تھا میری اس عادت پر بہت لوگوں کو اعتراض ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھے اصلی آرام صرف اسی طریقے پر بیٹھنے سے ملتا ہے۔

مینا جس کی دونوں آنکھیں بھینگی تھیں ڈائریکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا

"صاحب! وہ بولتا ہے کہ تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے پھر شور بند ہو جائے گا"

یہ روزمرہ کی بات تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی آدھ گھنٹے تک کارخانے میں صابن کٹتے اور ان پر ٹھپے لگتے رہیں گے چنانچہ ڈائریکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن سمیت اسٹوڈیو سے باہر چلے گئے میں وہیں کرسی پر بیٹھا رہا۔

سقفی لیمپ کی ناکافی روشنی میں سیٹ پر جو چیزیں پڑی تھیں ان کا درمیانی

فاصلہ اصلی فاصلے سے کچھ زیادہ دکھائی دے رہا تھا اور گیروے رنگ کے تھری پلائی وڈ کے تختے جو دیواروں کی صورت میں کھڑے تھے پست قد دکھائی دیتے تھے میں اس تبدیلی پر غور کر رہا تھا کہ پاس ہی سے آواز آئی ''السلام علیکم'' میں نے جواب دیا ''وعلیکم اسلام'' اور مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک نئی صورت نظر آئی میری آنکھوں میں ''تم کون ہو؟'' کا سوال تیرنے لگا آدمی ہوشیار تھا، فوراً کہنے لگا ''جناب میں آج ہی آپ کی کمپنی میں داخل ہوا ہوں۔۔۔۔میرا نام عبدالرحمٰن ہے خاص دہلی شہر کا رہنے والا ہوں۔۔۔۔۔آپ کا وطن بھی تو شاید دہلی ہی ہے۔''

میں نے کہا ''جی نہیں۔۔۔۔۔میں پنجاب کا باشندہ ہوں''

عبدالرحمٰن نے جیب سے عینک نکالی ''معاف فرمائیے گا، چونکہ ڈائریکٹر صاحب نے عینک اتار دینے کا حکم دیا تھا اس لیے۔۔۔۔''

اس دوران میں نے عینک بڑی صفائی سے کانوں میں اٹکالی اور میری طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا ''واللہ! میں تو یہی سمجھا تھا کہ آپ دہلی کے ہیں، یعنی آپ کی زبان میں قطعاً پنجابیت نہیں۔۔۔۔ماشاء اللہ کیا مکالمہ لکھا ہے۔۔۔۔قلم توڑ دیا ہے واللہ۔۔۔۔یہ اسٹوری بھی تو آپ ہی نے لکھی ہے؟''

عبدالرحمٰن نے جب یہ باتیں کیں تو اس کا قد بھی میری نظر میں تھری پلائی وڈ کے تختوں کی طرح پست ہو گیا میں نے روکھے پن کے ساتھ کہا ''جی نہیں''

وہ اور زیادہ لچکیلا ہو گیا ''عجیب زمانہ ہے صاحب، جو اہلیتوں کے مالک ہیں ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔۔۔۔یہ بمبئی شہر بھی تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا عجب اوٹ پٹانگ زبان بولتے ہیں یہاں کے لوگ، پندرہ دن مجھے یہاں آئے ہو گئے

ہیں مگر کیا عرض کروں سخت پریشان ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔آج آپ سے ملاقات ہو گئی۔۔۔۔'' اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ سے مل کر اس روغن کی مروڑیاں بنانا شروع کر دیں جو چہرے پر لگاتے وقت اس کے ہاتھوں پر رہ گیا تھا۔

میں نے جواب میں صرف ''جی ہاں'' کر دیا اور وہ خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاغذ کھولا اور روا روی میں لکھے ہوئے مکالموں پر نظر ثانی شروع کر دی چند غلطیاں تھیں جن کو درست کرنے کے لیے میں نے اپنا قلم نکالا عبدالرحمٰن ابھی تک میرے پاس کھڑا تھا مجھے اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے چنانچہ میں نے پوچھا ''فرمایئے''

اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا ''میں ایک بات عرض کروں''

''بڑے شوق سے''

''آپ اس طرح ٹانگیں اوپر کر کے نہ بیٹھا کریں''

''کیوں؟''

اس نے جھک کر کہا ''بات یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے قبض ہو جایا کرتا ہے''

''قبض؟''

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ''قبض کیسے ہو سکتا ہے'' یہ کہہ کر میرے جی میں آئی کہ اس سے کہوں ''میاں ہوش کی دوا کرو۔۔۔۔۔گھاس تو نہیں کھا گئے۔۔۔۔مجھے اس طرح بیٹھتے بیس برس ہو گئے۔۔۔۔آج کیا تمہارے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا'' مگر میں یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ بات بڑھ جائے گی اور مجھے بیکار کی مغز دردی کرنا پڑے گی۔

وہ مسکرایا عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ گیا" آپ نے مذاق سمجھا ہے حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ٹانگیں جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا کر بیٹھنے سے معدے کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔۔۔۔میں نے تو اپنی ناچیز رائے پیش کی ہے مانیں نہ مانیں یہ آپ کو اختیار ہے۔"

میں عجب مشکل میں پھنس گیا اس کو اب میں کیا جواب دیتا قبض۔۔۔۔۔یعنی قبض ہو جائے گا، بیس برس کے دوران میں مجھے قبض نہ ہوا لیکن آج اس مسخرے کے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے نہ کہ کرسی یا کوچ پر بیٹھنے سے جس طرح میں کرسی پر بیٹھتا ہوں اس سے تو آدمی کو راحت ہوتی ہے دوسروں کو نہ سہی لیکن مجھے تو اس سے آرام ملتا ہے۔اور یہ سچی بات ہے کہ مجھے ٹانگیں جوڑ کر سینے کے سات لگا کر دینے سے ایک خاص قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے اسٹوڈیو میں عام طور پر شوٹنگ کے دوران میں کھڑا رہنا پڑتا ہے جس سے آدمی تھک جاتا ہے دوسرے نامعلوم کس طریقے سے اپنی تھکن دور کرتے ہیں مگر میں تو اسی طریقے سے دور کرتا ہوں کسی کے کہنے پر میں اپنی یہ عادت کبھی نہیں چھوڑ سکتا خواہ قبض کے بجائے مجھے سرسام ہو جائے۔یہ ضد نہیں، دراصل بات یہ ہے کہ کرسی پر اس طرح بیٹھنے کا اندازہ میری عادت نہیں بلکہ میرے جسم کا ایک جائز مطالبہ ہے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں اکثر لوگوں کو میرے اس طرح بیٹھنے کے انداز پر اعتراض رہا ہے اس اعتراض کی وجہ نہ میں نے ان لوگوں سے کبھی پوچھی ہے اور نہ انہوں نے کبھی خود بتائی ہے اعتراض کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو

میں اس معاملے میں اچھی سے اچھی دلیل سننے کے لیے بھی تیار نہیں کوئی آدمی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔

جب عبدالرحمٰن نے مجھ پر نکتہ چینی کی تو میں بھنا گیا اور ان کا یوں شکریہ ادا کیا جیسے کوئی یہ کہے "لعنت ہو تم پر"

اس شکریئے کی رسید کے طور پر اس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر میلی سی مسکراہٹ پیدا کی اور خاموش ہو گیا اتنے میں ڈائریکٹر ہیرو اور ہیروئن آ گئے اور شوٹنگ شروع ہو گئی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے سے عبدالرحمٰن کے قبض سے نجات حاصل ہوئی۔

اس کی پہلی ملاقات پر ذیل کی باتیں میرے دماغ میں آئیں

1 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے بہت بڑا چغد ہے۔

2 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے سخت بدتمیز ہے۔

3 یہ ایکسٹرا جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے پرلے درجے کا مغز چاٹ ہے۔

4 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے مجھے اس سے بے حد نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

اگر مجھے کسی شخص سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی کچھ عرصے کے لیے زیادہ متحرک ہو جائے گی میں نفرت کرنے کے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہوں آپ پوچھیں گے بھلا نفرت کرنے میں مہارت کی کیا ضرورت ہے، لیکن میں آپ سے کہوں گا کہ ہر کام کرنے کے لیے ایک خاص سلیقے

کی ضرورت ہوتی ہے اور نفرت میں چونکہ شدت زیادہ ہے اس لیے اس کے عامل کا ماہر ہونا اشد ضروری ہے محبت ایک عام چیز ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں مگر نفرت بہت کم لوگوں نے کی ہے اور جنہوں نے کی ہے ان میں سے اکثر کو اس کا سلیقہ نہیں آیا نفرت محبت کے مقابلے میں بہت زیادہ لطیف اور شفاف ہے محبت میں مٹھاس ہے جو اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو دل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے مگر نفرت میں ایک ایسی ترشی ہے جو دل کا قوام درست رکھتی ہے۔

میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ نفرت اس طریقے سے کرنا چاہیے کہ اس میں محبت کرنے کا مزہ ملے شیطان سے نفرت کرنے کا جو سبق ہمیں مذہب نے سکھایا ہے مجھے اس سے سو فیصدی اتفاق ہے یہ ایک ایسی نفرت ہے جو شیطان کی شان کے خلاف نہیں اگر دنیا میں شیطان نام کی کوئی ہستی موجود ہے تو وہ یقیناً اس نفرت سے جو کہ اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے خوش ہوتی ہوگی اور سچ پوچھیے تو یہ عالمگیر نفرت ہی شیطان کی زندگی کا ثبوت ہے اگر ہمیں اس سے نہایت ہی بھونڈے طریقے پر نفرت کرنا سکھلایا جاتا تو دنیا ایک بہت بڑی ہستی کے تصور سے خالی ہوتی۔

میں نے عبدالرحمٰن سے نفرت کرنا شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری اور اس کی دونوں کی زندگی میں حرکت پیدا ہو گئی اسٹوڈیو میں اور اسٹوڈیو کے باہر جہاں کہیں اس سے میری ملاقات ہوتی میں اس کی خیریت دریافت کرتا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا۔

عبدالرحمٰن کا قد متوسط ہے اور بدن گٹھا ہوا جب وہ نیکر پہن کر آتا ہے تو اس کے بے بال پنڈلیوں کا گوشت فٹ بال کے نئے کور کے چمڑے کی طرح چمکتا ہے ناک موٹی جس کی کوٹھی ابھری ہوئی ہے چہرے کے خطوط منگولی ہیں ماتھا چوڑا جس پر گہرے زخم کا نشان ہے اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شیطان لڑکے نے اپنے ڈسک کی لکڑی میں چاقو سے چھوٹا سا گڑھا بنا دیا ہے پیٹ سخت اور ابھرا ہوا حافظ قرآن ہے چنانچہ بات بات میں آیتوں کے حوالے دیتا ہے کمپنی کے دوسرے ایکسٹرا اس کی اس عادت کو پسند نہیں کرتے اس لیے کہ انہیں احترام کے باعث چپ ہو جانا پڑتا ہے۔

ڈائریکٹر صاحب کو جب میری زبانی معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن صاف زبان بولتا ہے اور غلطی نہیں کرتا تو انہوں نے اسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا ایک ہی فلم میں اس سے دس مختلف آدمیوں کے بھیس میں لایا گیا سفید پوشاک پہنا کر اسے ہوٹل میں بیرا بنا کر کھڑا کر دیا گیا سر پر لمبے لمبے بال لگا کر اور چمٹا ہاتھ میں دے کر ایک جگہ اس کو سادھو بنایا گیا چپڑاسی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے چہرے پر گوند سے لمبی ڈاڑھی چپکا دی گئی ریلوے پلیٹ فارم پر بڑی مونچھیں لگا کر اس کو ٹکٹ چیکر بنا دیا گیا۔۔۔۔۔۔ یہ سب میری بدولت ہوا اس لیے کہ مجھے اس سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

عبدالرحمٰن خوش تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ اتنا مقبول ہو گیا اور میں خوش تھا کہ دوسرے ایکسٹرا اس سے حسد کرنے لگے ہیں میں نے موقع دیکھ کر سیٹھ سے سفارش کی چنانچہ تیسرے مہینے اس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ بھی ہو گیا اس کا

یہ نتیجہ ہوا کہ کمپنی کے پچیس ایکسٹراؤں کی آنکھوں میں وہ خار بن کے کھٹکنے لگا لطف یہ ہے کہ عبدالرحمٰن کو اس بات کی مطلق خبر نہ تھی کہ میری وجہ سے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے اور میری سفارشوں کے باعث کمپنی کے دوسرے ڈائریکٹر اس سے کام لینے لگے ہیں۔

فلم کمپنی میں کام کرنے کے علاوہ وہاں کے ایک مقامی ہفتہ وار اخبار کو بھی ایڈیٹ کرتا ہوں ایک روز میں نے اپنا اخبار عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں دیکھا جب وہ میرے قریب آیا تو مسکرا کر اس نے پرچے کی ورق گردانی شروع کر دی ''منشی صاحب۔۔۔۔۔۔یہ رسالہ آپ ہی۔۔۔۔''

میں نے فوراً ہی جواب دیا ''جی ہاں''

ماشاءاللہ، کتنا خوبصورت پرچہ نکالتے ہیں آپ۔۔۔۔۔۔کل رات اتفاق سے یہ میرے ہاتھ آ گیا۔۔۔۔بہت دلچسپ ہے، اب میں ہر ہفتے خریدا کروں گا۔

یہ اس نے اس انداز میں کہا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہے میں نے اس کا شکریہ ادا کر دیا، چنانچہ بات ختم ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جبکہ میں اسٹوڈیو کے باہر نیم کے پیڑ تلے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا اپنے اخبار کے لیے ایک کالم لکھ رہا تھا عبدالرحمٰن آیا اور بڑے ادب کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا میں نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا فرمائیے

''آپ فارغ ہو جائیں تو میں۔۔۔۔''

''میں فارغ ہوں۔۔۔۔۔۔فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے؟''

اس کے جواب میں اس نے ایک رنگین لفافے کو کھولا اور اپنی تصویر میری طرف بڑھا دی تصویر ہاتھ میں لیتے ہی جب میری نظر اس پر پڑی تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی یہ ہنسی چونکہ بے اختیار آئی تھی اس لیے میں اسے روک نہ سکا بعد میں جب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ عبدالرحمٰن کو یہ ناگوار معلوم ہوئی ہو گی تو میں نے کہا "عبدالرحمٰن صاحب اتفاق دیکھئے میں صبح سے پریشان تھا کہ ٹائٹل پیج کے بعد کا صفحہ کیسے پر ہو گا دو تصویروں کے بلاک مل گئے تھے مگر ایک کی کمی تھی۔۔۔۔اس وقت بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ نے اپنا فوٹو میری طرف بڑھا دیا۔۔۔بہت اچھا فوٹو ہے بلاک بھی اس کا خوب بنے گا۔"

عبدالرحمٰن نے اپنے موٹے ہونٹ اندر کی طرف سکیڑ لیے "آپ کی بڑی عنایت ہے۔۔۔۔تو۔۔۔۔تو کیا یہ تصویر چھپ جائے گی؟"

میں نے تصویر کو ایک نظر اور دیکھا اور مسکرا کر کہا "کیوں نہیں۔۔۔اس ہفتے ہی کے لیے تو میں یہ کہہ رہا تھا"

اس پر عبدالرحمٰن نے دوبارہ شکریہ ادا کیا "پرچے میں تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹ نکل جائے تو میں اور بھی ممنون ہوں گا۔۔۔۔جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔۔۔۔تو۔۔۔۔تو۔۔۔معاف کیجئے۔میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں"

یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ ملتا ہوا چلا گیا۔

میں نے اب تصویر کو غور سے دیکھا آری مانگ نکلی ہوئی تھی، ایک ہاتھ میں بمبئی کی بھاری بھرکم ڈائریکٹری تھی جس پر چھپے ہوئے حروف بتا رہے تھے کہ سن

سولہ کی یہ کتاب فوٹو گرافر نے اپنے گاہکوں کو تعلیم یافتہ دکھانے کے لیے ایک یا دو آنے میں خریدی ہوگی دوسرے ہاتھ میں جو اوپر کو اٹھا ہوا تھا ایک بہت بڑا پائپ تھا اس پائپ کی ٹونٹی عبدالرحمٰن نے اس انداز سے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا چائے کا پیالہ پکڑے ہے۔ لبوں پر چائے کا گھونٹ پیتے وقت جو ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا کرتا ہے وہ تصویر میں اس کے ہونوں پر جما ہوا دکھائی دیتا تھا آنکھیں کیمرے کی طرف دیکھنے کے باعث کھل گئی تھیں، ناک کے نتھنے تھوڑے پھول گئے تھے سینے میں ابھار پیدا کرنے کی کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی کیونکہ وہ اچھا خاصا کارٹون بن گیا تھا۔ یاد رہے کہ عبدالرحمٰن انگریزی لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا اور تمباکو سے پرہیز کرتا ہے۔

میں نے اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے اس کے فوٹو کا بلاک بنوایا اور وعدے کے مطابق ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ پرچے میں چھپوا دیا۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب میں کمپنی کے غلیظ ریستوران میں بیٹھا کڑوی چائے پی رہا تھا کہ عبدالرحمٰن تازہ پرچہ جس میں اس کی تصویر چھپی تھی ہاتھ میں لیے داخل ہوا اور آداب عرض کر کے میری کرسی کے پاس کھڑا ہو گیا اس کے ہونٹ اندر کی طرف سمٹ رہے تھے، آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ رہا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ممنون ہو رہا ہے بغل میں پرچہ دبا کر اس نے ہاتھ بھی ملنے شروع کر دیئے شکریئے کے کئی فقرے اس نے دل ہی دل میں بنائے ہوں گے مگر ناموزوں سمجھ کر انہیں منسوخ کر دیا ہوگا جب میں نے اسے اس ادھیڑ بن میں دیکھا تو ماتم پرسی کے انداز میں اس سے کہا" تصویر چھپ گئی آپ

کی۔۔۔۔۔۔؟'' نوٹ بھی پڑھ لیا آپ نے۔۔۔۔۔؟

''جی ہاں۔۔۔۔آپ کی بڑی نوازش ہے۔''

ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس اٹھی میرا رنگ پیلا پڑ گیا یہ درد بہت پرانا ہے جس کے دورے مجھے اکثر پڑتے رہتے ہیں میں اس کے دفعیے کے لیے سینکڑوں علاج کر چکا تھا مگر لا حاصل چائے پیتے پیتے یہ درد ایک دم اٹھا اور سارے سینے میں پھیل گیا عبدالرحمٰن نے میری طرف غور سے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا'' آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔''

میں اس وقت ایسے موڈ میں تھا کہ دشمنوں کو بھی اس موذی مرض کا شکار ہوتے نہ دیکھ سکتا، چنانچہ میں نے بڑے روکھے پن کے ساتھ کہا'' کچھ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں''

''جی نہیں، آپ کی طبیعت ناساز ہے۔۔۔'' وہ سخت گھبرا گیا'' میں۔۔۔۔ میں۔۔۔میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

'' میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ مطلق فکر نہ کریں۔۔سینے میں معمولی سا درد ہے، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

'' سینے میں درد ہے۔۔۔'' یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا'' سینے میں درد ہے تو۔۔۔۔۔۔تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو قبض ہے اور قبض۔۔۔۔''

قریب تھا کہ میں بھنا کر اس کو دو تین گالیاں سنا دوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔'' آپ۔۔۔۔۔۔حد کرتے ہیں آپ۔۔۔۔۔سینے کے درد سے قبض کو کیا

تعلق؟''

''جی نہیں۔۔۔قبض ہو تو ایک سو ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور سینے کا درد تو یقیناً قبض ہی کا نتیجہ ہے۔۔۔آپ کی آنکھوں کی زردی صاف ظاہر کرتی ہے کہ آپ کو پرانا قبض ہے اور جناب قبض کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو ایک دو روز تک اجابت نہ ہو، جی نہیں، آپ جس کو بافراغت اجابت سمجھتے ہیں ممکن ہے وہ قبض ہو۔۔۔سینہ اور پیٹ تو پھر بالکل پاس پاس ہیں قبض سے تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔۔۔میرا خیال ہے کہ آپ۔۔۔۔دراصل آپ کی کمزوری کا باعث بھی یہی قبض ہے۔''

عبدالرحمٰن چند لمحات کے لئے بالکل خاموش ہو گیا لیکن فوراً ہی اس نے اپنے لہجہ میں زیادہ چکناہٹ پیدا کر کے کہا'' آپ نے کئی ڈاکٹروں کا علاج کیا ہو گا۔۔۔۔ایک معمولی سا علاج میرا بھی کر دیکھئے۔۔۔۔خدا کے حکم سے یہ مرض بالکل دور ہو جائے گا۔''

میں نے پوچھا'' کون سا مرض؟''

عبدالرحمٰن نے زور زور سے ہاتھ ملے'' یہی۔۔۔۔۔یہی قبض''

لاحول ولا، اس بیوقوف سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے بقض ہے، صرف میرے سینے میں درد ہے جو کہ بہت پرانا ہے اور سب ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ اس کا باعث اعصاب کی کمزوری ہے مگر یہ نیم حکیم خطرہ جان برابر کہے جا رہا ہے کہ مجھے قبض ہے، قبض ہے، قبض ہے، کہیں ایسا نہ ہو میں اس کے سر پر غصے میں آ کر چائے کا پیالہ دے ماروں عجب نامعقول آدمی ہے، اپنی طبابت کا پٹارہ کھول بیٹھا ہے اور

کسی کو سنتا ہی نہیں۔

غصے کے باعث میں بالکل خاموش ہو گیا اس خاموشی کا عبدالرحمٰن نے فائدہ اٹھایا اور قبض کا علاج بتانا شروع کر دیا خدا معلوم اس نے کیا کیا کچھ کہا۔۔۔۔

''بات یہ ہے کہ پیٹ میں آپ کے سدے پڑ گئے ہیں آپ کو روز اجابت تو ہو جاتی ہے مگر یہ سدے باہر نہیں نکلتے معدے کا فعل چونکہ درست نہیں رہا اس لیے انتڑیوں میں خشکی پیدا ہو گئی ہے۔ رطوبت یعنی وہ لیس دار مادہ جو فضلے کو نیچے پھسلنے میں مدد دیتا ہے آپ کے اندر بہت کم ہو گیا ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ رفع حاجت کے وقت آپ کو ضرورت سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہو گا قبض کھولنے کے لیے عام طور پر جو انگریزی مسہل دوائیں بازار میں بکتی ہیں بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہیں اس لیے کہ ان سے عادت پڑ جاتی ہے اور جب عادت پڑ جائے تو آپ خیال فرمائیے کہ ہر روز پاخانہ لانے کے لیے آپ کو دو تین آنے خرچ کرنے پڑیں گے۔۔۔ یونانی دوائیں اول تو ہم لوگوں کے مزاج کے موافق ہیں دوسرے۔۔۔۔''

میں نے تنگ آ کر اس سے کہا ''آپ چائے پئیں گے؟'' اور اس کا جواب سنے بغیر ہوٹل والے کو آرڈر دیا ''گلاب، ان کے لیے ایک ڈبل چائے لاؤ''

چائے فوراً ہی آ گئی، عبدالرحمٰن کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا ''معاف کیجئے گا، مجھے ڈائریکٹر صاحب کے ساتھ ایک سین کے متعلق بات چیت کرنا ہے۔۔۔۔ پھر کبھی گفتگو ہو گی۔''

یہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ قبض کی باقی داستان عبدالرحمٰن کی زبانی پر

منجمد ہوگئی اور میں ریستوران سے باہر نکل گیا درد شروع ہونے کے باعث میری طبیعت خراب ہوگئی تھی، اس کی باتوں نے اس تکدر میں اور بھی اضافہ کر دیا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیوں اس بات پر مصر ہے کہ مجھے قبض ہے میری صحت دیکھ کر وہ کہہ سکتا تھا کہ میں مدقوق ہوں جیسا کہ عام لوگ میرے متعلق کہتے آئے ہیں وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ مجھے سل ہے میری انتڑیوں میں ورم ہے، میرے معدے میں رسولی ہے، میرے دانت خراب ہیں مجھے گٹھیا ہے مگر بار بار اس کا اس بات پر زور دینا کیا معنی رکھتا تھا کہ مجھے قبض ہو رہا ہے یعنی اگر مجھے واقعی قبض تھا تو اس کا احساس مجھے پہلے ہونا چاہیے تھا نہ کہ حافظ عبدالرحمٰن کو؟۔۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھے قبض کا بیمار کیوں بنا رہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں چلا گیا وہ کرسی پر بیٹھے ہیرو، ولن اور تین چار ایکسٹراؤں کے ساتھ گپیں ہانک رہے تھے آؤٹ ڈور شوٹنگ چونکہ بادلوں کے باعث ملتوی کر دی گئی تھی اس لیے سب کو چھٹی تھی مجھے جب ہیرو کے پاس بیٹھے تین چار منٹ گزر گئے تو معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرحمٰن کی باتیں ہو رہی ہیں میں ہمہ تن گوش ہو گیا ایک ایکسٹرا نے اس کے خلاف کافی زہر اگلا دوسرے نے اس کی مختلف عادات کا مضحکہ اڑایا تیسرے نے اس کے مکالمہ ادا کرنے کی نقل اتاری ہیرو کو حافظ عبدالرحمٰن کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ اس کی بول چال میں زبان کی غلطیاں نکالتا رہتا ہے ولن نے ڈائریکٹر صاحب سے کہا" بڑا واہیات آدمی ہے صاحب، کل ایک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ میرا ایکٹنگ بالکل فضول ہے آپ اس کو ایک بار ذرا ڈانٹ بتا دیجیے۔"

ڈائریکٹر صاحب مسکرا کر کہنے لگے ''تم سب کو اس کے خلاف شکایت ہے مگر اسے میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے''

تین چار آدمیوں نے اکٹھے پوچھا ''وہ کیا؟''

ڈائریکٹر صاحب نے پہلی مسکراہٹ کو طویل بنا کر کہا ''وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی قبض ہے جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا میں اس کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ مجھے قبض وبض نہیں ہے لیکن وہ مانتا نہیں ابھی تک اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مجھے قبض ہے کئی علاج مجھے بتا چکا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے اس طرح ممنون کرنا چاہتا ہے''

میں نے پوچھا ''وہ کیسے''

''یہ کہنے سے کہ مجھے قبض ہے اور پھر اس کا علاج بتانے سے۔۔۔۔وہ مجھے ممنون ہی تو کرنا چاہتا ہے ورنہ پھر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔۔۔۔؟ بات دراصل یہ ہے کہ اسے صرف اسی مرض کا علاج معلوم ہے یعنی اس کے پاس چند ایسی دوائیں موجود ہیں جن سے قبض دور ہو سکتا ہے چونکہ مجھے وہ خاص طور پر ممنون کرنا چاہتا ہے اس لیے ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ جونہی مجھے قبض ہو وہ فوراً علاج شروع کر کے مجھے ٹھیک کر دے۔۔۔۔آدمی دلچسپ ہے۔''

ساری بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔''

ڈائریکٹر صاحب۔۔۔۔۔آپ کے علاوہ حافظ صاحب کی نظر عنایت خاکسار پر بھی ہے۔۔۔میں نے کل ان کا فوٹو اپنے پرچے میں چھپوایا ہے اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے ابھی ابھی ہوٹل میں انہوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش

کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے۔۔۔۔خدا کا شکر ہے کہ میں ان کے اس حملے سے بچ گیا اس لیے کہ مجھے قبض نہیں ہے۔"

اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے قبض ہو گیا، یہ قبض ابھی تک جاری ہے یعنی اس کو پورے دو مہینے ہو گئے ہیں میں کئی پیٹنٹ دوائیں استعمال کر چکا ہوں مگر ابھی تک اس سے نجات حاصل نہیں ہوئی اب میں سوچتا ہوں کہ حافظ عبدالرحمٰن کو اپنی خواہش پوری کرنے کا ایک موقع دے ہی دوں کیا حرج ہے۔۔۔۔۔مجھے اس سے محبت تو ہے نہیں۔

☆☆☆☆☆☆

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا'' دس لیف۔۔۔۔۔ویری بیڈ'' یعنی یہ زندگی بہت بری ہے جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آ جاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی'' صاحب! ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا'' اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی وہ حیرت سے اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی'' صاحب! تم ایک دم الو کا پٹھا ہے حرامزادہ ہے۔۔۔۔ سمجھا'' یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے صرف چھ، یعنی مہینے میں دو اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے تین روپے سے زیادہ کوئی مانتا ہی نہیں تھا سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا "بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دیں گے" نہ جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا "دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی اس سے ایک ادھیلا تم کم کہو تو میں نہ لوں گی اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ" چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا "لائیے ایک روپیہ دودھ کا" اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلیمہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ۔۔۔۔۔ بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا اس فلیٹ میں اپنا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے تل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا شروع شروع میں تو اس شور نے

اسے بہت ڈرایا تھا پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانہ میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کیے گئے ہیں، یہ زنجیر اس لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اس نے زنجیر پکڑ کر اٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائی ڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا ''کیا ہوا؟۔۔۔۔۔۔یہ چیخ تمہاری تھی؟''

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا اس نے کہا'' یہ موا پیخانہ ہے یا کیا ہے۔۔۔۔۔بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے میری کمر میں درد تھا میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھما کا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں''

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے خدا بخش راولپنڈی کا تھا انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا، چنانچہ چار

برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہوگئی اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالے میں ہے وہ اس کی تلاش میں انبالے آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی سلطانہ نے اس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کو سمبندھ ہوگیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ نعیت الاعتقاد تھی اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہوگئی چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہوگئی، چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے اور اس کی

آمدنی پہلے سے دوگنی ہوگئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوالیں دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کرلیں گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کرلیا بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی، چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ چلی گئی تھی میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی ''یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے'' یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کرلیا کرتی تھی اسی طرح

اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں ''کوئلوں کی دکان'' لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی جہاں ''شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے'' لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اس کارخانہ کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی چونکہ سیٹھ صاب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں، چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی، پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی اس نے خدا بخش سے کہا'' کیا بات ہے خدا بخش! دو مہینے آج پورے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔۔۔۔۔ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے'' خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا، پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا'' میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ، دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا راستہ بھول گئے ہیں۔۔۔۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ۔۔۔'' وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا ایک آدمی اندر داخل ہوا یہ پہلا

گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں آئیں تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے سلطانہ پریشان ہوگئی ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا ''تم میری سنو اور چلو واپس انبالے میں یہاں کیا دھرا ہے۔۔۔۔؟ بھئی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا چلو، وہیں چلتے ہیں جو نقصان ہوا اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو اس کنگنی کو بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں آج رات کی گاڑی یہاں سے چل دیں گے۔''

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا ''نہیں جان من! انبالہ اب نہیں جائیں گے، یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بڑا کارساز ہے یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔''

سلطانہ چپ ہو رہی، چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دیکھا ہوا تھا پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم

رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی کبھی چھالیا کاٹتی رہتی، کبھی پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی بالکونی میں آ کر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں، کبھی ادھر کبھی ادھر، ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں اسے نظر آتا دھند لکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے تھے اور

آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہوا کیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔۔۔۔ نہ جانے کہاں؟ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے، چنانچہ جب

اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا خدا بخش سے اس نے بارہا کہا "دیکھو، میرے حال پر رحم کرو یہاں گھر میں رہا کرو میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں" مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہا کہ اس کی تشفی کر دی "جان من۔۔۔۔ میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا۔"

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا مختار نے ہیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں اس کے ساتھ میچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے گھر بالکل خالی تھا خدا بخش حسب معمول باہر تھا دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی

رہی، پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو اٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی تا کہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا شام کا وقت تھا چھڑکاؤ ہو چکا تھا اس لیے گرد و غبار دب گیا تھا بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں، سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا ''آپ اوپر آتے ڈر رہے تھے'' وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا ''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔۔ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟'' اس پر سلطانہ نے کہا ''یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے'' وہ یہ سن کر پھر مسکرایا ''تمہیں غلط فہمی ہوئی میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف

دیکھ رہا تھا وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی مجھے یہ منظر پسند آیا پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا سبز روشنی مجھے پسند ہے آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے'' یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا سلطانہ نے پوچھا'' آپ جا رہے ہیں؟'' اس آدمی نے جواب دیا'' نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ''

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھائے اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا'' میرا نام شنکر ہے''

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا چنانچہ اس نے شنکر سے کہا'' فرمائیے۔۔۔۔''

شنکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا'' میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ، بلایا تمہیں نے ہے مجھے'' جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا'' میں سمجھا، لو اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے

ہیں ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔"

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی "آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا "یہی جو تم لوگ کرتے ہو"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں۔۔۔۔میں۔۔۔۔میں کچھ بھی نہیں کرتی"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا"

سلطانہ نے بھنا کر کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔۔۔۔۔آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی"

"جھک مارتی ہوں"

"میں بھی جھک مارتا ہوں"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں"

"میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا"

"ہوش کی دوا کرو۔۔۔یہ لنگر خانہ نہیں"

"اور میں بھی والنٹیر نہیں ہوں"

سلطانہ یہاں رک گئی اس نے پوچھا "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں"

شنکر نے جواب دیا ''الو کے پٹھے''

''میں بھی الو کی پٹھی نہیں''

''مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الو کا پٹھا ہے''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے''

یہ کہہ کر شنکر ہنسا

اس پر سلطانہ نے کہا ''تم ہندو ہو، اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔''

شنکر مسکرایا ''ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے، پنڈت مالویہ اور مسٹر جناح اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں''

''جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو۔۔۔۔ بولو رہو گے؟''

''اسی شرط پر جو میں پہلے بتا چکا ہوں''

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی ''تو جاؤ رستہ پکڑو''

شنکر آرام سے اٹھا پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا ''میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا۔۔۔۔ میں بہت کام کا آدمی ہوں''

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا

جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا ''تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟''

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا، کہنے لگا ''پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔۔۔۔''

''کچھ انہوں نے تم سے کہا؟''

''نہیں ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے۔۔۔۔۔ پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی، اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا، خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی ''سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو۔۔۔۔۔۔ میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں، نہ کہیں جا سکتی ہوں نہ آ سکتی ہوں محرم سر پر آ گیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں، اب تم ہی بتاؤ کیا ہو گا؟۔۔۔۔ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو کچھ تو

سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا "پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے۔۔۔۔۔۔خدا کے لیے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی، پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے، کیا پتا ہے کہ کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم۔۔۔۔"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا "تم خدا کے لیے کچھ کرو چوری کرو یا ڈاکہ مارو، پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو میرے پاس سفید بوسکی کی ایک قمیص پڑی ہے، اس کو میں کالا رنگوا لوں گی سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا، یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی کالا رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے، سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو۔۔۔۔دیکھو تمہیں میری جان کی قسم، کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو۔۔۔۔۔۔میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ"

خدا بخش اٹھ بیٹھا "اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو۔۔۔۔۔میں کہاں سے لاؤں گا۔۔۔۔۔افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس پیسہ نہیں"

"کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے"

"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے۔۔۔۔تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی اب سوا روپے گز کے حساب

سے ملتی ہے ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟''

''اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا'' یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا ''لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ، میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں''

ہوٹل سے کھانا آیا دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے صبح ہوئی خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی، دوپہر کا کھانا کھایا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔

یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے کئی دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی، جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں موری کے پاس پہنچ چکی تھی نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آ کھڑی ہوئی قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی اب شام ہو گئی تھی بتیاں روشن ہو رہی تھیں نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے تھے سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی تھی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی دفعتاً اسے شنکر نظر آیا مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے دراصل

اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے اس کا اپنا گھر ہے، چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا ''تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔۔۔۔ میں ایسی باتوں پر ناراض نہیں ہوا کرتا''

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی، کہنے لگی ''نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے''

شنکر اس پر مسکرا دیا ''تو میری شرطیں تمہیں منظور ہے''

''کیسی شرطیں؟'' سلطانہ نے ہنس کر کہا ''کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟''

''نکاح اور شادی کیسی؟۔۔۔۔۔ نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گی نہ میں یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں۔۔۔ چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کروں''

''بولو کیا بات کروں؟''

''تم عورت ہو۔۔۔۔ کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔''

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی کہنے لگی ''صاف صاف کہو، تم مجھ سے کہا چاہتے ہو۔''

''جو دوسرے چاہتے ہیں'' شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا

''تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا''

''تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق

ہے ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں''

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا ''میں سمجھ گئی ہوں''

''تم کہو، کیا ارادہ ہے؟''

''تم جیتے، میں ہاری، پر میں کہتی ہوں آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔''

''تم غلط کہتی ہو۔۔۔۔اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔۔۔۔۔تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟''

''سلطانہ ہے ہے''

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا ''میرا نام شنکر ہے۔۔۔۔۔یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہے، چلو آؤ اندر چلیں''

☆☆☆☆☆

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے نہ جانے کس بات پر جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا ''شنکر میری ایک بات مانو گے؟''

شنکر نے جواباً کہا ''پہلے بات بتاؤ''

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی ''تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر''

''کہو، کہو۔۔۔۔رک کیوں گئی ہو''

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا ''بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔۔۔۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔''

شنکر نے یہ سن کر کہا ''تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔''

سلطانہ نے فوراً ہی کہا ''نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار بنوا دو۔''

شنکر مسکرایا ''میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے، بہر حال میں کوشش کروں گا محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی اے بس اب خوش ہو گئیں'' سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا ''کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟''

سلطانہ نے ہنس کر کہا ''تم انہیں کیا کرو گے چاندی کے معمولی بندے ہیں زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔''

اس پر شنکر نے کہا ''میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی بولو دیتی ہو۔''

''لے لو'' یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیئے اس کو بعد میں افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا ''ساٹن کی کالی شلوار ہے۔۔۔۔۔دیکھ لینا شاید لمبی ہو۔۔۔۔اب میں چلتا ہوں''

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں بال بکھرے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا ساٹن کی کالی شلوار تھی ایسی ہی جیسی کہ وہ انوری کے پاس دیکھ کر آئی تھی سلطانہ بہت خوش ہوئی بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی قمیص اور دوپٹہ لے کر آئی تینوں کالے کپڑے اتنے جب پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی سلطانہ نے دروازہ کھولا تو انوری اندر داخل ہوئی اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا'' قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے، پر یہ شلوار نئی ہے۔۔۔۔۔کب بنوائی؟''

سلطانہ نے جواب دیا ''آج ہی درزی لایا ہے'' یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں ''یہ بندے تم نے کہاں سے لیے؟''

انوری نے جواب دیا ''آج ہی منگوائے ہیں''

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

☆☆☆☆☆

کبوتروں والا سائیں

پنجاب کے ایک سرد دیہات کے تکیے میں مائی جیواں صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس زمین کے اندر کھدے ہوئے گڈھے میں بڑے بڑے اپلوں سے آگ سلگا رہی ہے صبح کے سرد اور مٹیالے دھندلکے میں جب وہ اپنی پانی بھری آنکھوں کو سکیڑ کر اور اپنی کمر کو دہرا کر کے منہ قریب قریب زمین کے ساتھ لگا کر اوپر تلے رکھے ہوئے اپلوں کے اندر پھونک گھسیڑنے کی کوشش کرتی ہے تو زمین پر سے تھوڑی سی راکھ اڑتی ہے اور اس کے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر جو کہ گھسے ہوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی اور آ گئی ہے۔

اپلوں کے اندر آگ سلگتی ہے اور یوں جو تھوڑی سی لال لال روشنی پیدا ہوتی ہے مائی جیواں کے سیاہ چہرے پر جھریوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔

مائی جیواں یہ آگ کئی مرتبہ سلگا چکی ہے یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے اندر بنی ہوئی قبر کی بابت اس کے پردادا نے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے، ایک زمانے سے ان کے قبضہ میں تھی گاما سائیں کے مرنے کے بعد اب اس کی ہوشیار بیوی اس تکیے کی مجاور تھی، گاما سائیں سارے گاؤں میں ہر دلعزیز تھا ذات کا وہ کمہار تھا مگر چونکہ اسے تکیے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے اس نے برتن بنانے چھوڑ دیئے تھے، لیکن اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کونڈیاں اب بھی مشہور ہیں بھنگ گھوٹنے کے لیے وہ سال بھر میں چھ کونڈیاں

بنایا کرتا تھا جن کے متعلق بڑے فخر سے وہ یہ کہا کرتا تھا" چودھری لوہا ہے لوہا۔۔۔فولاد کی کونڈی ٹوٹ جائے پر گاما سائیں کی یہ کونڈی دادا لے تو اس کا پوتا بھی اسی میں بھنگ گھوٹ کر پیے۔"

مرنے سے پہلے گاما سائیں چھ کونڈیاں بنا کر رکھ گیا تھا جو اب مائی جیواں بڑی احتیاط سے کام میں لاتی تھی۔

گاؤں کے اکثر بڈھے اور جوان تکیے میں جمع ہوتے تھے اور سردائی پیا کرتے تھے گھوٹنے کے لیے گاما سائیں نہیں تھا پر اس کے بہت سے چیلے چانٹے جو اب سر بھویں منڈا کر سائیں بن گئے تھے، اس کے بجائے بھنگ گھوٹا کرتے تھے اور مائی جیواں کی سلگائی ہوئی آگ سلفہ پینے والوں کے کام آتی تھی۔

صبح اور شام کو تو خیر کافی رونق رہتی تھی مگر دوپہر کو آٹھ دس آدمی مائی جیواں کے پاس بیری کی چھاؤں میں بیٹھے ہی رہتے تھے ادھر ادھر کونے میں لمبی لمبی بیل کے ساتھ ساتھ کئی کابک تھے جن میں گاما سائیں کے ایک بہت پرانے دوست ابو پہلوان نے سفید کبوتر پال رکھے تھے تکیے کی دھوئیں بھری فضا میں ان سفید اور چتکبرے کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی جس طرح تکیے میں آنے والے لوگ شکل وصورت سے معصومانہ حد تک بے عقل نظر آتے تھے اسی طرح یہ کبوتر جن میں سے اکثر کے پیروں میں مائی جیواں کے بڑے لڑکے نے جھانجھ پہنا رکھے تھے بے عقل اور معصوم دکھائی دیتے تھے۔

مائی جیواں کے بڑے لڑکے کا اصلی نام عبدالغفار تھا اس کی پیدائش کے وقت یہ نام شہر کے تھانیدار کا تھا جو کبھی کبھی گھوڑی پر چڑھ کے موقع دیکھنے کے لئے گاؤں

میں آیا کرتا تھا اور گاما سائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا پیالہ سردائی کا ضرور پیا کرتا تھا لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی جب وہ گیارہ برس کا تھا تو مائی جیواں اس کے نام میں تھانیدار کی بو سونگھ سکتی تھی مگر جب اس نے بارہویں سال میں قدم رکھا تو اس کی حالت ہی بگڑ گئی خاصا تگڑا جوانت ھا پر نہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برسوں میں ہی بچ مچ کا سائیں بن گیا ناک سے رینٹھ بہنے لگا اور چپ چپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی سے چھوٹا تھا پر اب کچھ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور منہ سے ہر وقت لعاب سا نکلنے لگا پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کی ناک سے رینٹھ اور منہ سے لعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اس سے غیب کی باتیں پوچھنا شروع کر دی ہیں اس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اسے ڈھارس ہوئی کہ چلو یوں بھی تو کما ہی لے گا کمانا وانا کیا تھا عبدالغفار جس کو اب کبوتروں والا سائیں کہتے تھے، گاؤں میں پھر پھرا کر آٹا چاول اکٹھا کر لیا کرتا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ اس کی ماں نے اس کے گلے میں ایک جھولی لٹکا دی تھی جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے کبوتروں والا سائیں اسے اس لیے کہا جاتا تھا کہ اسے کبوتروں سے بہت پیار تھا تکیے میں جتنے کبوتر تھے ان کی دیکھ بھال ابو پہلوان سے زیادہ یہی کیا کرتا تھا۔

اس وقت وہ سامنے کوٹھڑی میں ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر اپنے باپ کا میلا کچیلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا باہر اس کی ماں آگ سلگا رہی تھی ۔۔۔۔

چونکہ سردیاں اپنے جوبن پر تھیں اس لیے گاؤں ابھی تک رات اور صبح کے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام دھندوں

میں مصروف تھے مگر تکیہ جو کہ گاؤں سے فاصلہ پر تھا ابھی تک آباد نہ ہوا تھا، البتہ دور کونے میں مائی جیواں کی بکری زور زور سے ممیا رہی تھی۔

مائی جیواں آگ سلگا کر بکری کے لیے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی مڑ کر دیکھا تو اسے ایک اجنبی سر پر ٹھاٹا اور موٹا سا کمبل اوڑھے نظر آیا پگڑی کے ایک پلو سے اس آدمی نے اپنا چہرہ آنکھوں تک چھپا رکھا تھا جب اس نے موٹی آواز میں "مائی جیواں السلام علیکم" کہا تو پگڑی کا کھردرا کپڑا اس کے منہ پر تین چار مرتبہ سکڑا اور پھیلا۔

مائی جیواں نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کیے بغیر کہا "وعلیکم السلام! آؤ بھائی بیٹھو آگ تاپو"

مائی جیواں کمر پر ہاتھ رکھ کر اس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سلگتی رہتی تھی اجنبی اور وہ دونوں پاس پاس بیٹھ گئے تھوڑی دیر ہاتھ تاپ کر اس آدمی نے مائی جیواں سے کہا "ماں! اللہ بخشے گاما سائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا اس کے مرنے کی خبر ملی تو مجھے بہت صدمہ ہوا مجھے آسیب ہو گیا تھا، قبرستان کا جن ایسا چمٹا تھا کہ اللہ کی پناہ، گاما سائیں کے ایک ہی تعویذ سے یہ کالی بلا دور ہو گئی۔"

مائی جیواں خاموشی سے اجنبی کی باتیں سنتی رہی جو کہ اس کے شوہر کا بہت ہی معتقد نظر آتا تھا اس نے ادھر ادھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے کہا "میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں ایک خاص بات کہنے کے لئے" اجنبی نے رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اس کی بات کوئی اور تو نہیں سن رہا اور بھنچے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا "میں سندر ڈاکو کے گروہ کا آدمی ہوں پرسوں

رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے والے ہیں خون خرابہ ضرور ہوگا، اس لیے میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکوں کو دور ہی رکھنا میں نے سنا ہے کہ گاما سائیں مرحوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں جوان آدمیوں کا لہو ہے بابا، ایسا نہ ہو کہ جوش مارا اٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔۔۔۔تم ان کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیج دو تو ٹھیک رہے گا۔۔۔۔۔بس مجھے یہی کہنا تھا میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔۔۔۔۔السلام علیکم!''

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے الاؤ پر زور زور سے مل کر اٹھا اور جس راستے سے آیا تھا اسی راستے باہر چلا گیا۔

سندر جاٹ بہت بڑا ڈاکو تھا اس کی دہشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو اسی کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں بے شمار گیت اس کی بہادری اور بے باکی کے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے اس کا نام سن کر بہت سی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے سندر جاٹ کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے تو ہر شخص اس سے اپنی اچانک ملاقات کے من گھڑت قصے سنانے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا اس کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے بعض کہتے تھے کہ وہ بہت قد آور جوان ہے، بڑی بڑی مونچھوں والا ان مونچھوں کے بالوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دو بڑے بڑے لیموں انکی مدد سے اٹھا سکتا ہے بعض لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے مگر بدن اس قدر گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی نہ ہوگا بہر حال سب متفقہ طور پر اس کی طاقت اور بے باکی کے معترف تھے۔

جب مائی جیواں نے یہ سنا کہ سندر جاٹ ان کے گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آرہا ہے تو اس کے آئے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس اجنبی کے سلام کا جواب تک نہ دے سکی اور نہ اس کا شکریہ ہی ادا کر سکی مائی جیواں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سندر جاٹ کا ڈاکہ کیا معنی رکھتا ہے پچھلی دفعہ جب اس نے ساتھ والے گاؤں پر حملہ کیا تھا تو سکھی لالہ مہاجن کی ساری جمع پونجی غائب ہو گئی تھی اور گاؤں کی سب سے سندر اور چنچل چھوکری بھی ایسی گم ہوئی تھی کہ اب تک اس کا پتہ نہیں ملتا تھا یہ بلا اب ان کے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے مائی جیواں کے گاؤں میں کسی اور کو نہ تھا مائی جیواں نے سوچ کہ وہ اس آنے والے بھونچال کی خبر کس کس کو دے۔۔۔۔چودھری کے گھر خبر کر دے۔۔۔۔۔لیکن نہیں وہ تو بڑے کمینے لوگ تھے پچھلے دنوں اس نے تھوڑا سا ساگ ان سے مانگا تھا تو انہوں نے انکار کر دیا تھا گھسیٹا رام حلوائی کو متنبہ کر دے۔۔۔نہیں، وہ بھی ٹھیک آدمی نہیں تھا۔

وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی گاؤں کے سارے آدمی وہ ایک ایک کر کے اپنے دماغ میں لائی اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اس نے مہربانی کے قابل نہ سمجھا اس کے علاوہ اس نے سوچا اگر اس نے کسی سے ہمدردی کے طور پر اس راز سے آگاہ کر دیا تو وہ کسی اور پر مہربانی کرے گا اور یوں سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے گا جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا آخر میں وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ کی غلاف چڑھی قبر کے سرہانے گاڑ دے گی اور رحمٰن کو پاس والے گاؤں میں بھیج دے گی۔

جب وہ سامنے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھی تو دہلیز میں اسے عبدالغفار یعنی

کبوتروں والا سائیں کھڑا نظر آیا۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہنسا اس کی یہ ہنسی آج خلاف معمول معنی خیز تھی مائی جیواں کو اس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور متانت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوشمندی کی نشانی ہے۔

جب وہ کوٹھڑی کے اندر جانے لگی تو عبدالغفار نے پوچھا "ماں، یہ صبح سویرے کون آدمی آیا تھا؟"

عبدالغفار اس قسم کے سوال عام طور پر پوچھا کرتا تھا، اس لیے اس کی ماں جواب دیئے بغیر اندر چلی گئے اور اپنے چھوٹے لڑکے کو جگانے لگی "ارے رحمٰن، ارے رحمٰن اٹھ، اٹھ"

بازو جھنجھوڑ کر مائی جیواں نے اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا اور وہ جب آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور اچھی طرح ہوش میں آ گیا تو اس کی ماں نے اس کو ساری بات سنا دی رحمٰن کے تو اوسان خطا ہو گئے وہ بہت ڈرپوک تھا گو اس کی عمر اس وقت بائیس برس کی تھی اور کافی طاقتور جوان تھا مگر اس میں ہمت اور شجاعت نام تک کو نہ تھی سندر جاٹ!۔۔۔۔ اتنا بڑا ڈاکو، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ تھوک پھینکتا تھا تو پورے بیس گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا، پرسوں ڈاکہ ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کے لیے آ رہا تھا۔ وہ فوراً اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہو گیا بلکہ یوں کہیے کہ وہ اسی وقت گاؤں چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

رحمٰن کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی جو کہ گاؤں کی ایک بے باک شوخ اور چنچل لڑکی تھی گاؤں کے سب جوان لڑکے شباب کی یہ پوٹلی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی بڑے بڑے

ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اڑا دیتی تھی۔ چودھری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلائی پکڑنے میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر دور دور سے اس کو نیچا دکھانے کے لیے آئے تھے مگر اس کی کلائی کسی سے بھی نہ مڑی تھی وہ گاؤں میں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا مگر اس کی یہ ساری اکڑفوں نیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی جب اس نے دھان کے کھیت میں اس سے کہا ''فجے! گنڈا سنگھ کی کلائی مروڑ کر تو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلے میں کوئی آدمی ہی نہیں رہا۔۔۔۔ آ، میرے سامنے بیٹھ، میری کلائی پکڑ، ان دو انگلیوں کی ایک ہی ٹھمکی سے تیرے دونوں ہاتھ نہ چھڑا دوں تو نیتی نام نہیں۔۔۔۔''

فضل دین اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کی طاقت اور شہزوری کے رعب اور دبدبے میں آ کر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائے گی اگر وہ انکار کرتا ہے تو نیتی اور بھی سر پر چڑھ جاتی ہے اور اگر وہ اس کی دعوت قبول کرتا ہے تو لوگ یہی کہیں گے عورت ذات سے مقابلہ کرتے شرم تو نہیں آئی مردود کو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کرے چنانچہ اس نے نیتی کی دعوت قبول کر لی تھی اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے اس نے جب نیتی کی گدرائی ہوئی کلائی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کا سارا کانپ رہا تھا نیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں دھنس گئیں، ایک نعرہ بلند ہوا اور نیتی کی کلائی فضل کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔۔۔۔ اس دن سے لے کر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلائی نہیں پکڑی۔

ہاں، تو اس نیتی سے رحمن کو محبت تھی، جیسا کہ وہ آپ ڈرپوک تھا اسی طرح اس

کا پریم بھی ڈرپوک تھا دور سے دیکھ رک وہ اپنے دل کی ہوش پوری کرتا تھا اور جب کبھی وہ اس کے پاس ہوتی تو اس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ حرف مدعا زبان پر لائے مگر نیتی سب کچھ جانتی تھی وہ کیا کچھ نہیں جانتی تھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چھوکرا جو درختوں کے تنوں کے ساتھ پیٹھ ٹیکے کھڑا رہتا ہے اس کے عشق میں گرفتار ہے اس کے عشق میں کون گرفتار نہیں تھا؟۔۔۔۔۔۔سب اس سے محبت کرتے تھے اس قسم کی محبت جو کہ بیریوں کے بیر پکنے پر گاؤں کے جوان لڑکے اپنی رگوں کے تناؤ کے اندر محسوس کیا کرتے ہیں مگر وہ ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی محبت کرنے کی خواہش البتہ اس کے دل میں اس قدر موجود تھی کہ وہ بالکل اس شرابی کے مانند معلوم ہوتی تھی جس کے متعلق ڈر رہا کرتا ہے کہ اب گرا اور اب گرا۔۔۔۔۔۔۔وہ بے خبری کے عالم میں ایک بہت اونچی چٹان کی چوٹی پر پہنچ چکی تھی اور اب تمام گاؤں والے اس کی افتاد کے منتظر تھے جو کہ یقینی تھی۔۔۔۔

رحمن کو بھی اس افتاد کا یقین تھا مگر اس کا ڈرپوک دل ہمیشہ اسے ڈھارس دیا کرتا تھا کہ نہیں، نیتی آخر تیری ہی باندی بنے گی اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔

جب رحمن دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہنچنے کے لیے تیار ہو کر تکیے سے باہر نکلا تو اسے راستے میں نیتی کا خیال آیا مگر اس وقت اس نے یہ نہ سوچا کہ سندر جاٹ دھاوا بولنے والا ہے وہ دراصل نیتی کے تصور میں اس قدر مگن تھا اور اکیلے میں اس کے ساتھ من ہی من میں اتنے زوروں سے پیار و محبت کر رہا تھا کہ اسے کسی اور بات کا خیال ہی نہ آیا البتہ جب وہ گاؤں سے پانچ کوس آگے نکل گیا

تو ایکا ایکی اس نے سوچا کہ نیتی کو تو بتا دینا چاہیے تھا کہ سندر جاٹ آ رہا ہے لیکن اب واپس کون جاتا۔

عبدالغفار یعنی کبوتروں والا سائیں تکیے سے باہر نکلا اس کے منہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چمکتا رہتا تھا تکیے سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گزار دیتا تھا۔ شام کو جب ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو آتے تو ان کے چلنے سے جو دھول اڑتی ہے اس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آ جاتی تھی گاؤں اس کو پسند نہیں تھا اجاڑ اور سنسان جگہوں سے اسے غیر محسوس طور پر محبت تھی یہاں بھی لوگ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے جب برسات میں دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کے لیے دعا مانگے اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اس سے اپنے دل کا حال بیان کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے، نوجوان چھوکریاں بھی چپکے چپکے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کرتی تھیں اور یہ جاننا چاہتی تھیں کہ ان کے "ماہیا" کا دل کیسا ہے عبدالغفار ان سوالیوں کو اوٹ پٹانگ جواب دیا کرتا تھا اس لیے کہ اسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں، لیکن لوگ جو اس کے پاس سوال لے کر آتے تھے اس کی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔

عبدالغفار مختلف کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اس کنویں کے پاس پہنچ گیا جو کہ ایک زمانے سے بیکار پڑا تھا اس کنویں کی حالت بہت ابتر تھی اس بوڑھے برگد کے

پتے جو کہ سالہا سال سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا اس قدر اس میں جمع ہو گئے تھے کہ اب پانی نظر ہی نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی مکڑیوں نے مل کر پانی کی سطح پر موٹا سا جالا بن دیا ہے اس کنویں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر عبدالغفار بیٹھ گیا اور دوپہر کی اداس فضا میں اس نے اپنے وجود سے اور بھی اداسی پیدا کر دی۔

دفعتاً اڑتی ہوئی چیلوں کو اداس چیخوں کو عقب میں چھوڑتی ہوئی ایک بلند آواز اٹھی اور بوڑھے برگد کی شاخوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی نیتی گا رہی تھی۔

ماہیا مرے نے باگ لوایا
چمپا، مہ دا خواب کھلایا
اسی تو لوایاں کھٹیاں وے
راتی سونڑ نہیں دیندیاں اکھیاں وے

اس گیت کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماہیا یعنی میرے چاہنے والے نے ایک باغ لگایا ہے، اس میں ہر طرح کے پھول اگائے ہیں، چمپا، مہ دا وغیرہ کھلائے ہیں، اور ہم نے تو صرف نارنگیاں لگائی ہیں۔۔۔۔ رات کو آنکھیں سونے نہیں دیتیں۔۔۔۔۔ کتنی انکساری برتی گئی ہے معشوق عاشق کے لگائے ہوئے باغ کی تعریف کرتا ہے، لیکن وہ اپنی جوانی کے باغ کی طرف نہایت انکسارانہ طور پر اشارہ کرتا ہے جس میں حقیر نارنگیاں لگی ہیں، اور پھر شب خوابی کا گلہ کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

گو عبدالغفار میں نازک جذبات بالکل نہیں تھے لیکن پھر بھی نیتی کی جوان آواز نے اس کو چونکا دیا اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا اس نے پہچان لیا تھا کہ یہ آواز

نیتی کی ہے۔

گاتی گاتی نیتی کنویں کی طرف آنکلی غفار کو دیکھ کر وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی" اوہ غفار سائیں۔۔۔۔تم۔۔۔۔اوہ، مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں۔۔۔اور اس وقت یہاں تمہارے اور میرے سوا اور کوئی بھی نہیں دیکھو میں تمہارا منہ میٹھا کراؤں گی اگر تم نے میرے دل کی بات بوجھ لی اور۔۔۔۔لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو۔۔۔اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چھپا تھوڑی رہتا ہے۔"

وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے میلے کرتے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

خلاف معمول کبوتروں والا سائیں مسکرایا مگر نیتی اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی اس کی نگاہیں گاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں کھردرے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس نے گردن اٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا۔" غفار سائیں تم اللہ میاں سے محبت کرتے ہو اور میں۔۔۔۔میں ایک آدمی سے محبت کرتی ہوں تم میرے دل کا حال کیا سمجھو گے۔۔۔۔اللہ میاں کی محبت اور اس کے بندے کی محبت ایک جیسی تو ہو نہیں سکتی۔کیوں غفار سائیں۔۔۔۔ارے تم بولتے کیوں نہیں کچھ بولو۔۔۔۔کچھ کہو۔۔۔۔اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی۔۔۔تم نہیں جانتے کہ آج میں کتنی دیر بول سکتی ہوں۔۔۔۔تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی۔۔۔۔" یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہوگئی اور اس کی سنجیدگی زیادہ بڑھنے لگی اپنے من وغوطہ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اس نے ایکا ایکی عبدالغفار سے پوچھا"

سائیں۔۔۔۔میں کب تھکوں گی؟''

عبدالغفار کے منہ سے لعاب نکلنا بند ہو گیا اس نے کنویں کے اندر جھک کر دیکھتے ہوئے جواب دیا ''بہت جلد''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اس پر نیتی نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبرا کر پوچھا ''کب؟۔۔۔۔۔کب؟۔۔۔۔۔سائیں کب؟''

عبدالغفار نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور ببول کے جھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا نیتی کچھ دیر کنویں کے پاس سوچتی رہی پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا ادھر چل دی۔

☆☆☆☆☆

وہ رات جس میں سندر جاٹ گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آ رہا تھا مائی جیواں نے آنکھوں میں کاٹی ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لحاف اوڑھے جاگتی رہی وہ بالکل اکیلی تھی رحمٰن کو اس نے دوسرے گاؤں بھیج دیا اور عبدالغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا ابو پہلوان کبھی کبھی تکیے میں آگ تاپتا تاپتا وہیں الاؤ کے پاس سو جایا کرتا تھا مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا، چنانچہ کبوتروں کو دانہ مائی جیواں ہی نے کھلایا تھا۔

تکیہ گاؤں کے اس سرے پر واقع تھا جہاں سے لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے تھے مائی جیواں ساری رات جاگتی رہی مگر اس کو ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہ دی جب رات گزر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں تو وہ سندر جاٹ کی بات سوچتی سوچتی سو گئی۔

چونکہ رات کو وہ بالکل نہ سوئی تھی اس لیے صبح بہت دیر کے بعد جاگی کوٹھڑی سے نکل کر جب وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ ابو پہلوان کبوتروں کو دانہ دے رہا ہے اور دھوپ سارے تکیے پر پھیلی ہوئی ہے اس نے باہر نکلتے ہی اس سے کہا" ساری رات مجھے نیند نہیں آئی یہ موا بڑھاپا تنگ کر رہا ہے صبح سوئی ہوں اور اب اٹھی ہوں۔۔۔۔۔۔ہاں تم سناؤ کل کہاں رہے؟"

ابو نے جواب دیا" گاؤں میں"

اس پر مائی جیواں نے کہا" کوئی تازہ خبر سناؤ"

ابو نے جھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر جھپٹ کر ایک کبوتر کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا" آج صبح چوپال پر نتھا سنگھ کہہ رہا تھا کہ گام چمارہ کی وہ لونڈیا۔۔۔۔۔کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔؟ہاں وہ نیتی کہیں بھاگ گئی ہے۔۔۔میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا۔۔۔حرامزادی نے سارا گاؤں سر پر اٹھا رکھا تھا۔"

"کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اٹھا کر لے گیا ہے؟"

"جانے میری بلا۔۔۔۔۔لیکن میرے خیال میں تو وہ خود ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

مائی جیواں کو اس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا سندر جاٹ نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا پر ایک چھوکری تو غائب ہو گئی تھی اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیتی کا غائب ہو جانا سندر جاٹ سے متعلق ہو جائے چنانچہ وہ ان تمام لوگوں سے نیتی کے بارے میں پوچھتی رہی جو کہ تکیے میں آتے جاتے رہے لیکن جو کچھ ابو نے بتایا تھا اس سے

زیادہ اسے کوئی بھی نہ بتا سکا۔

شام کو رحمٰن لوٹ آیا اس نے آتے ہی ماں سے سندر جاٹ کے ڈاکہ کے متعلق پوچھا اس پر مائی جیواں نے کہا ''سندر جاٹ تو نہیں آیا بیٹا پر نیتی غائب ہو گئی ہے۔۔۔ ایسی کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔''

رحمٰن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں میں دس کوس او چلنے کی تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔

ایک دم یہ تبدیلی دیکھ کر مائی جیواں نے تشویشناک لہجے میں اس سے پوچھا'' کیا ہوا بیٹا!''

رحمٰن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا'' کچھ نہیں ماں۔۔۔۔ تھک گیا ہوں۔''

''اور نیتی کل مجھ سے پوچھتی تھی، میں کب تھکوں گی؟''

رحمٰن نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے منہ کا لعاب پونچھ رہا تھا رحمٰن نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا'' کیا کہا تھا اس نے تجھ سے؟''

عبدالغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا'' کہتی تھی کہ میں تھکتی ہی نہیں۔۔۔۔ پر اب وہ تھک جائے گی۔''

رحمان نے تیزی سے پوچھا'' کیسے؟''

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی'' مجھے کیا معلوم۔۔۔۔؟ سندر جاٹ جانے اور وہ جانے''

یہ سن کر رحمن کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھا گئی اور مائی جیواں کی جھریاں زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2008

گرم سوٹ

گنڈا سنگھ نے چونکہ ایک زمانے سے اپنے کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے اس لیے پسینے کے باعث ان میں ایک عجیب قسم کی بو پیدا ہو گئی تھی جو زیادہ شدت اختیار کرنے پر اب گنڈا سنگھ کو کبھی کبھی اداس کر دیتی تھی اس کو اس بدبو نے کبھی اتنا تنگ نہیں کیا تھا جتنا کہ اب اس کے گرم سوٹ نے اسے تنگ کر رکھا تھا۔

اپنے کسی دوست کے کہنے پر وہ امرتسر چھوڑ کر دہلی چلا آیا تھا جب اس نے امرتسر کو خیر باد کہا تو گرمیوں کا آغاز تھا لیکن اب کہ گرمی اپنے پورے جوبن پر تھی، گنڈا سنگھ کو یہ گرم سوٹ بہت ستا رہا تھا۔

اس کے پاس صرف چار کپڑے تھے۔ گرم پتلون، گرم کوٹ، گرم واسکٹ اور ایک سوتی قمیض، یہ گرم سوٹ اسے اس لیے دہلی کی شدید گرمیوں میں پہننا پڑتا تھا کہ اس کے پاس کوئی اور کپڑا ہی نہیں تھا اور سوٹ کے ساتھ کی واسکٹ اسے اس لیے پہننا پڑتی تھی کہ اس کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ اسے احتیاط یا بد احتیاطی سے رکھ سکتا یوں تو وہ اس واسکٹ کو یا کوٹ ہی کو دریبہ کلاں میں اپنے دوست کی دکان میں رکھ دیتا مگر وہاں اسنے پہلے روز ہی کئی چوہے دیکھے تھے دہلی آنے کے دوسرے روز چاندنی چوک میں اس نے رس گلے کھائے تھے ان کا شیرہ جا بجا کوٹ اور واسکٹ پر گر پڑا تھا۔ اگر وہ یہ دونوں چیزیں اس دکان میں رکھ دیتا تو ظاہر ہے کہ جہاں جہاں شیرہ گرا تھا چوہے کپڑا کتر جاتے اور گنڈا سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سوٹ جو اسے 3 ستمبر 1939ء یعنی اس جنگ کے ابتدائی روز ملا تھا یوں

بیکار چوہوں کی نذر ہو جائے اس سوٹ کے ساتھ اتفاقیہ طور پر ایک ایسا دن منسوب ہو گیا تھا جو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

گنڈا سنگھ کو چنانچہ اس لیے بھی اپنا سوٹ عزیز تھا امرتسر میں جب اس نے اپنا یہ تاریخی سوٹ پہنا تھا تو دربار صاحب کے آس پاس اس کے جتنے ہاتھی دانت کا کام کرنے والے دوست رہتے تھے متحیر ہو گئے تھے بلبیر نے جب اسے بازار میں دیکھا تو متحرک خراد کو روک کر زور سے آواز دی تھی ''گنڈا سیاں۔۔۔۔۔ گنڈا سیاں ذرا ادھر تو آ۔۔۔ یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے؟''

گنڈا سنگھ لباس کے معاملے میں از حد بے پروا تھا بلکہ یوں کہیے کہ اپنے لباس کی طرف اس نے کبھی توجہ ہی نہ دی تھی وہ پتلون اسی طرح پہنا کرتا تھا جس طرح کچھ پہنی جاتی ہے یعنی بغیر کسی تکلف کے اس کے متعلق اس کے دوستوں میں یہ بات عام مشہور تھی کہ اگر تن ڈھکنا ضروری نہ ہوتا تو گنڈا سنگھ بالکل ننگا رہتا۔

چھ چھ مہینے تک وہ نہاتا نہیں تھا بعض اوقات اس کے پیروں پر اس قدر میل جم جاتا تھا کہ اور میل جمنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی دور سے اگر آپ اس کے میلے پیروں کو دیکھتے تو یہی معلوم ہوتا کہ گنڈا سنگھ نے موزے پہن رکھے ہیں۔

گنڈا سنگھ کی غلاظت پسندی کی انتہا یہ تھی کہ وہ صبح کا ناشتہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر کرتا تھا اور سردیوں میں ایک ایسا لحاف اوڑھ کر سوتا تھا کہ اگر کوئی اسے گھورے پر پھینک دیتا تو صبح جب بھنگی کوڑا کرکٹ اٹھانے آتا تو یہ لحاف دیکھ کر اس کو بھی گھن آ جاتی، پر لطف یہ ہے کہ اس کی ان تمام غلاظتوں کے باوجود لوگ اسے پسند کرتے تھے اور امرتسر میں تو آپ کو ایسے کئی آدمی مل جائیں گے جو اس کو محبت کی حد تک

پسند کرتے ہیں۔

گنڈا سنگھ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس برس ہے ڈاڑھی اور مونچھوں کے بھوسلے بال اس کے چہرے کے دو تہائی حصے پر موبل آئل میں بھیگے ہوئے چیتھڑے کی طرح پھیلے رہتے ہیں پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں کی بھی یہی حالت رہتی ہے کبھی کبھی جب اس کی پنڈلیاں کپڑا اٹھ جانے کے باعث ننگی ہو جاتی ہیں تو اس پر میل کھرنڈوں کی شکل میں جا بجا نظر آتا ہے مگر لوگ اب تمام میلی اور گندی حقیقتوں سے باخبر ہونے پر بھی گنڈا سنگھ کو اپنے پاس بٹھاتے ہیں اور اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے ہیں۔

امرتسر چھوڑ کر جب گنڈا سنگھ اپنے گرم سوٹ سمیت دہلی آیا تو اسے غیر شعوری طور پر معلوم تھا کہ یہاں بھی خود بخود اس کے دوست پیدا ہو جائیں گے اگر اس کو اپنی غلاظت پسندیوں کا احساس ہوتا تو بہت ممکن ہے یہ احساس رکاوٹ بن جاتا اور دہلی میں اس کا کوئی دوست نہ بنتا۔

چند ہی دنوں میں بظاہر کسی وجہ کے بغیر آٹھ دس آدمی گنڈا سنگھ کے دوست بن گئے اور گنڈا سنگھ کو اس بات کا مطلق احساس نہ ہوا کہ اگر یہ آٹھ دس آدمی اس کے دوست نہ بنتے تو دہلی شہر میں وہ بھوکوں مرتا روٹی کے مسئلے پر دراصل گنڈا سنگھ نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا اور نہ اس نے کبھی یہ جاننے کی تکلیف کی تھی کہ دوسرے اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں کھانا، پینا اور سونا، یہ تین چیزیں ایسی تھیں جو گنڈا سنگھ کو چلتے پھرتے کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتی تھیں اور ایک زمانے سے چونکہ یہ چیزیں اسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ مل رہی تھیں اس لیے ان کے متعلق وہ کبھی

سوچتا ہی نہیں تھا۔

چاؤڑی میں ہربنس سے ملنے گیا تو وہاں صبح کا ناشتہ مل گیا ہربنس کے یہاں سے آیا تو راستے میں احمد علی نے اپنی دکان پر ٹھہرالیا اور کہا گنڈا سنگھ، بھئی تم خوب وقت پر آئے، میں نے دھنا مل سے کچھ چاٹ منگوائی ہے کھا کے جانا احمد علی کی دکان پر چاٹ کھانے کے بعد گنڈا سنگھ کے دل میں خیال آیا کہ چلو ہیم چندر سے ملنے چلیں ہیم چندر بہت اچھا افسانہ نگار ہے اور گنڈا سنگھ کے دل میں اس کی بہت عزت ہے، چنانچہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا دعوت دینے اور دعوت قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا کھانا آیا اور دونوں نے مل کر کھالیا یہاں سے جب گنڈا سنگھ تمار پور کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں باغ آ گیا دھوپ چونکہ بہت کراری تھی، اس لیے گنڈا سنگھ جب کچھ دیر ستانے کے لیے نکلسن باغ کے ایک بنچ پر لیٹا تو پانچ بجے وہیں وہیں سویا رہا آنکھیں مل کر اٹھا اور آہستہ آہستہ تمار پور کا رخ کیا جہاں اس کا دوست عبدالمجید رہتا تھا چھ بجے کے قریب گنڈا سنگھ عبدالمجید کے گھر پہنچا وہاں جنگ کی باتیں شروع ہوئیں چنانچہ آٹھ بج گئے عبدالمجید بہت ہوشیار آدمی تھا ہندوستان کے ترقی پسند لٹریچر کے بارے میں اس کی معلومات کافی وسیع تھیں مگر جنگ کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں تھا کوشش کرنے کے باوجود وہ چین اور جاپان، جاپان اور روس، روس اور جرمنی اور فرانس کے جغرافیائی رشتے کو نہ سمجھ سکا تھا جب کبھی وہ دنیا کا نقشہ کھول کر اپنے سامنے رکھتا تو اس کی نگاہوں میں نقشے پر پھیلے ہوئے شہر اور ملک ایک ایسے الجھاؤ کی صورت اختیار کر لیتے جو اکثر اوقات پتنگ اڑانے کے

دوران میں اس کی ڈور میں پیدا ہو جایا کرتے تھے مگر گنڈا سنگھ کو دنیا کے جغرافیہ پر کافی عبور حاصل تھا ایک بار اخبار پڑھ لینے کے بعد جنگ کا صحیح نقشہ اس کے ذہن میں آجاتا تھا اور وہ بڑے سہل انداز میں لوگوں کو سمجھا سکتا تھا کہ جنگ کے میدان میں کیا ہو رہا ہے۔

عبدالمجید طبعاً نفاست پسند تھا، اس کو گنڈا سنگھ کی غلاظتیں بہت کھلتی تھیں مگر وہ مجبور تھا اس لیے کہ گنڈا سنگھ ہی ایک ایسا آدمی تھا جو اسے جنگ کے تازہ حالات سمجھا سکتا تھا اگر عبدالمجید کو جنگی خبریں سننے اور ان پر تفصیلی بحث کرنے کی عادت نہ ہوتی جو ایک بہت بڑی کمزوری کی شکل اختیار کر چکی تھی تو وہ یقیناً اس آدمی سے کبھی ملنا پسند نہ کرتا جو کھانا کھانے کے بعد سالن سے بھرے ہوئے ہاتھ اس کے کمرے میں لٹکے ہوئے پردوں سے صاف کرتا تھا ایک دفعہ عبدالمجید نے پردوں کو اس کے حملے سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنا تولیہ آگے بڑھا دیا اور کہا ''لو گنڈا سنگھ، اس سے ہاتھ صاف کر لو کچھ دیر اگر ٹھہر سکو تو پانی اور صابن آ رہا ہے''

گنڈا سنگھ نے اس انداز سے تولیہ عبدالمجید سے لیا جیسے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اور ایک منٹ میں اپنا ہاتھ صاف کر کے اسے ایک طرف پھینک دیا ''پانی وانی کی کوئی ضرورت نہیں، ہاتھ صاف ہی تھے۔''

عبدالمجید نے جب زہر کے گھونٹ پی کر اپنے تولیے کی طرف دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ منہ ہاتھ صاف کرنے کے بجائے کسی نے اس کے ساتھ سائیکل کی چین صاف کی ہے۔

عبدالمجید کی بیوی کو گنڈا سنگھ کی یہ مکروہ عادات سخت ناپسند تھیں مگر وہ بھی مجبور

تھی اس لیے کہ جس روز گنڈا سنگھ نہیں آتا تھا عبدالمجید اسے اپنے پاس بٹھا کر جنگ کے تازہ حالات پر ایک طویل لیکچر دینا شروع کر دیتا تھا جو اس امن پسند عورت کو طوعاً و کرہاً سارے کا سارا سننا ہی پڑتا تھا۔

گنڈا سنگھ ذہین آدمی تھا ادب اور سیاست کے بارے میں اس کی معلومات اوسط آدمی سے بہت زیادہ تھیں امرتسر میں اس کے اس گرم سوٹ کا سودا بھی ان معلومات کے ذریعے ہی سے ہوا تھا محمد عمر ٹیلر ماسٹر کو جنگی خبریں سننے کا خبط تھا، چنانچہ گنڈا سنگھ نے جنگ کے ابتدائی حالات سنا سنا کر محمد عمر کو اس قدر مرعوب کیا کہ اس نے یہ گرم سوٹ (جو کہ کسی گاہک نے 37ء میں تیار کرایا تھا اور دو برس سے اس کے پاس بیکار پڑا تھا چونکہ اس گاہک نے پھر کبھی شکل ہی نہیں دکھائی تھی) گنڈا سنگھ کے جسم پر فٹ کر دیا اور اس کے ساتھ پانچ روپے ماہوار کی چھ قسطیں مقرر کر لیں۔

ان چھ قسطوں میں سے صرف تین قسطیں گنڈا سنگھ نے ادا کی تھیں باقی تین قسطوں کے لئے محمد عمر کئی بار تقاضا کر چکا تھا مگر ان رسمی تقاضوں کے علاوہ محمد عمر نے گنڈا سنگھ پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا تھا اس لیے کہ جنگ کے حالات دن بدن دلچسپ ہوتے جا رہے تھے۔

گنڈا سنگھ نے امرتسر کیوں چھوڑا یہ ایک لمبی کہانی ہے دہلی میں جو اس کے نئے دوست بنے تھے ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ امرت سر میں ایک پرانے دوست کے کہنے پر وہ یہاں چلا آیا تھا کہ ملازمت تلاش کرے۔

دہلی آ کر گنڈا سنگھ ملازمت کی جستجو کرتا مگر یہ کم بخت گرم سوٹ اسے چین نہیں

لینے دیتا تھا اس قدر گرمی پڑ رہی تھی کہ چیل انڈا چھوڑ دے کچھ دنوں سے تو گرمی کی انتہا ہو گئی تھی لوگ سن سٹروک سے مر رہے تھے گنڈا سنگھ کو موت کا اتنا خیال نہیں تھا جتنا کہ اسے اس تکلیف کا خیال تھا جو گرمی کی شدت کے باعث اسے اٹھانا پڑ رہی تھی بازاروں میں دھوپ پگھلی ہوئی آگ کی طرح پھیلی رہتی تھی لو اس غضب سے چلتی تھی کہ منہ پر آگ کے چانٹے سے پڑتے تھے لک پھری سڑکیں توے کے مانند تپتی رہتی تھیں ان سب کے اوپر فضا کی وہ گرم گرم اداسی تھی جو گنڈا سنگھ کو بہت پریشان کرتی تھی۔

اگر اس کے پاس یہ گرم سوٹ نہ ہوتا تو الگ بات تھی، شدید گرمیوں کا یہ موسم کسی نہ کسی حیلے کٹ ہی جاتا پر اس سوٹ کی موجودگی میں جس کا رنگ اس کی بھوسلی ڈاڑھی سے بھی زیادہ گہرا تھا اب ایک دن بھی دہلی میں رہنا اسے دشوار معلوم ہوتا تھا اس سوٹ کا رنگ سردیوں میں بہت خوشگوار معلوم ہوتا تھا پر اب گنڈا سنگھ کو اس سے ڈر لگتا تھا۔

سوٹ کا کپڑا بہت کھردرا تھا، کوٹ کا کالر گھسنے کے باعث بالکل ریگ مار کی صورت اختیار کر گیا تھا اس سے گنڈا سنگھ کو بہت تکلیف ہوتی تھی، یہ گھسا ہوا کالر ہر وقت اوپر نیچے ہو کر اس کی گردن کے بال مونڈتا رہتا تھا۔

ایک دو دفعہ جب غضب کی گرمی پڑی تو گنڈا سنگھ کے جی میں آئی کہ یہ گرم سوٹ اتار کر کسی ایسی جگہ پھینک دے کہ پھر اسے نظر نہ آئے مگر یہ سوٹ اگر وہ اتار دیتا تو اس کی جگہ پہنتا کیا اس کے پاس تو اس سوٹ کے سوا اور کوئی کپڑا ہی نہیں تھا یہ مجبوری گرمی کے احساس میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی تھی اور بے چارہ گنڈا سنگھ تلملا

کے رہ جاتا تھا۔

دہلی میں اس کے چند دوستوں نے اس سے پوچھا تھا۔ ''بھئی گنڈا سنگھ! تم یہ گرم سوٹ کیوں نہیں اتارتے کیا تمہیں گرمی نہیں لگتی؟'' گنڈا سنگھ چونکہ ذہین آدمی تھا اس لیے اس نے یوں جواب دیا تھا۔ گرم کپڑا گرمی کی شدت کو روکتا ہے' اسی لیے یہ گرم سوٹ پہنتا ہوں۔ سن اسٹروک کا اثر ہمیشہ گردن کے نچلے حصے پر پڑتا ہے جہاں حرام مغز ہوتا ہے۔ اگر جسم کے اس حصے پر گرم کپڑے کی ایک موٹی سی تہہ جمی رہے تو سورج کے اس حملے کا بالکل خدشہ نہیں رہتا۔ افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں انگریز وغیرہ سولر ہیٹ کے پچھلے حصے کے ساتھ ایک کپڑا لٹکا دیتے ہیں کہ لو سے بچے رہیں۔ عرب میں سر کے لیے ایک خاص پہناوا مروج ہے۔ ایک بڑا سا رومال ہوتا ہے جو گردن کو ڈھانپے رہتا ہے۔ ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں شدید گرمی پڑتی ہے پگڑی کا استعمال اب تک چلا آ رہا ہے۔ شملہ چھوڑنے کا اصل مطلب یہی تھا کہ گردن لو سے محفوظ رہے۔ مگر اب لوگوں نے شملہ چھوڑنا قریب قریب ترک کر دیا ہے اس لیے کہ اسے فضول سمجھا گیا ہے اور بغیر شملہ چھوڑے پگڑی باندھنا جدید فیشن بن گیا ہے۔ میں خود اس فیشن کا شکار ہوں''۔

یہ فاضلانہ جواب سن کر اس کے دوست بہت مرعوب ہوئے تھے' چنانچہ پھر کبھی انہوں نے گنڈا سنگھ سے اس کے سوٹ کے بارے میں استفسار نہ کیا تھا۔ گنڈا سنگھ جس کو اپنی معلومات کا مظاہرہ کرنے کا شوق تھا اس وقت یہ جواب دے کر بہت مسرور ہوا تھا مگر یہ مسرت فوراً ہی ایک سوٹ کی تکلیف دہ گرمی نے غائب کر دی

تھی۔

عبدالمجید تمار پور یعنی شہر کے مضافات میں رہتا تھا جہاں کھلی فضا میسر آ سکتی ہے۔ ایک رات جب تازہ جنگی حالات پر تبصرہ کرتے کرتے دیر ہو گئی تو عبدالمجید نے گنڈا سنگھ کے لیے برآمدے کے باہر ایک چارپائی بچھوا دی کوٹ اور واسکٹ اتار کر وہ پتلون سمیت اس چارپائی پر صبح چھ بجے تک سویا رہا۔ رات بڑے آرام میں کٹی۔ کھلی فضا تھی اس لیے ساری رات خنک ہوا کے جھونکے آتے رہے۔ گنڈا سنگھ کو یہ جگہ پسند آئی چنانچہ اس نے شام کو دیر سے آنا شروع کر دیا۔

عبدالمجید کی بیوی نے دس بارہ روز تک گنڈا سنگھ کا وہاں سونا برداشت کیا لیکن اس کے بعد اس سے رہا نہ گیا۔ عبدالمجید سے اس نے صاف صاف کہہ دیا ''اصغر کے ابا اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اس موئے گنڈا سنگھ کا یہاں آنا بالکل پسند نہیں کرتی۔ مکان ہے یا سرائے ہے؟..... یعنی وہ عین کھانے کے وقت آ جاتا ہے ادھر ادھر کی باتیں آپ سے کرتا ہے اور چارپائی بچھوا کر سو جاتا ہے۔ میں اس کی غلاظتیں برداشت کر سکتی ہوں مگر اس کا یہاں سونا بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔

سنا

عبدالمجید کو خود گنڈا سنگھ کا وہاں سونا برا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ اس کی بیوی پرلی طرف آنگن میں اکیلی پڑی رہتی تھی مگر وہ کیا کرتا جبکہ جنگ کی دلچسپ باتیں کرتے کرتے دیر ہو جاتی تھی اور گنڈا سنگھ بغیر کسی تکلف کے جیسے کہ اس کا روزانہ کا معمول ہو۔ اس سے کہہ دیتا تھا بھائی عبدالمجید اب تم سو جاؤ..... صبح اٹھ کر تازہ اخبار دیکھیں گے تو نئے حالات کا کچھ پتہ چلیگا''۔ یہ کہہ کر وہ برآمدے میں سے

چارپائی نکالتا اور باہر بچھا کر سو جاتا۔

جب عبدالمجید کی بیوی اس پر بہت بری تو اس نے کہا ''جان من! میں خود حیران ہوں کہ اس کو کس طرح منع کروں۔ یہاں دہلی میں اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ مجھے تو اب اس بات کا خوف لاحق ہو رہا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرے مکان کو اپنا اڈا بنا لے گا۔ آدمی بے حد اچھا ہے' ذہین ہے پر..... کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے''۔

یہ سن کر عبدالمجید کی بیوی نے کہا ''تو یہ ترکیب تم ہی سوچو..... میں تو صاف گو ہوں اور اگر مجھے کہو گے تو میں کھلے لفظوں میں اس سے کہہ دوں گی کہ تمہارا یہاں رہنا مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے''۔

عبدالمجید نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ وہ گنڈا سنگھ سے اپنی مشکلات اور مجبوریاں صاف لفظوں میں بیان کر دیگا چنانچہ جب شام کو گنڈا سنگھ آیا تو جنگ کے تازہ حالات پر بحث شروع کرنے کے بجائے عبدالمجید نے اس سے کہا ''گنڈا سنگھ! مُس تم سے ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے''۔

گنڈا سنگھ نے ہمہ تن گوش ہو کر جواب دیا ''برا ماننے کی بات ہی کیا ہے۔ آپ کہیے''۔

اس پر عبدالمجید نے ایک مختصر سی رسمی تمہید شروع کی پھر اسکے آخر میں کہا ''بات یہ ہے کہ سردیوں میں ایک سے زیادہ آدمیوں کی رہائش کا انتظام کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ اس موسم میں گنجائش نکل آتی ہے مگر ان گرمیوں میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ مردوں کو اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ مستورات کو ہو جاتی ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو''۔

گنڈا سنگھ مطلب سمجھ گیا چنانچہ اس نے پہلی مرتبہ اپنی تکلیفیں بیان کرنا شروع کیں۔ ''بھائی عبدالمجید میں تمہاری مہربانیوں کا بہت شکرگزار ہوں۔ رات کاٹنے کے لیے یوں تو مجھے بہت جگہیں مل سکتی ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ ایسی کھلی ہوا کہیں نہیں ملتی۔ سارا دن اس گرم سوٹ میں پگھلتا رہتا ہوں۔ چند راتیں جو میں نے تمہارے یہاں بسر کی ہیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے تمہاری مجبوریوں اور تکلیفوں کا احساس اب ہوا ہے۔ اس لیے جو آرام مجھے یہاں رات کو ملتا تھا اس قدر خوشگوار تھا کہ میں نے دوسرے پہلو پر کبھی غور ہی نہ کیا..... تم میرے دوست ہو کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ اس گرم سوٹ سے مجھے نجات مل جائے' اس طور پر کہ یہ گرم سوٹ بھی میرے پاس رہے اور گرمیوں کا موسم بھی کٹ جائے کیونکہ دو تین مہینے کے بعد پھر سردیاں آنے والی ہیں اور مجھے پھر اس سوٹ کی ضرورت ہوگی ..... سچ پوچھو تو اب میں دیوانگی کی حد تک اس سوٹ کی گرمی سے بیزار آ گیا ہوں..... تم خود سمجھتے ہو''۔

عبدالمجید سب سمجھ گیا' جب گنڈا سنگھ رخصت ہوا تو عبدالمجید نے اپنی بیوی سے بات چیت کی۔ دونوں دیر تک اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں اس کی بیوی نے کہا ''صرف ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ گنڈا سنگھ کو کسی ایسی جگہ بھیج دیا جائے جہاں گرمی نہ ہو''۔

یہ سن کر عبدالمجید نے کہا ''ٹھیک ہے پر اس کے لیے رقم کی ضرورت ہے' اگر میرے پاس فالتو روپے ہوتے تو کیا میں نے اسے ٹھنڈے کپڑے نہ بنوا دیے ہوتے''۔

اس پر عبدالمجید کی بیوی نے کہا ''تم پوری بات تو سن لیا کرو۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ اسے شملہ بھیج دیا جائے میرا بھائی نصیر کل آنے والا ہے۔ اس سے کہہ دیں گے وہ گنڈا سنگھ کو بغیر ٹکٹ کے وہاں پہنچا دے گا..... ایک دو بار وہ تمہیں بھی تو شملہ لے گیا تھا''۔

عبدالمجید یہ بات سن کر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنی بیوی کا منہ چوم لیا۔

''بھئی کیا ترکیب سوچی ہے..... یعنی سوٹ گنڈا سنگ کے جسم پر ہی رہے گا اور وہ شملے پہنچ جائے گا..... اس سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے''۔

دوسرے روز شام کو گنڈا سنگھ آیا تو عبدالمجید نے شملہ جانے کی رائے پیش کی۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے قطعاً نہ سوچا کہ شملے جا کر وہ بغیر روپے پیسے کے کس طرح گزارہ کرے گا۔ دراصل ایسی باتوں پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

تیسرے دن نصیر نے گنڈا سنگھ کو گاڑی پر سوار کرا دیا اور گارڈ نے جو کہ اس کا دوست تھا کہہ دیا تھا کہ وہ اسے بحفاظت تمام شملے پہنچا دے۔

گولی

شفقت دوپہر کو دفتر سے آیا تو گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ عورتیں تھیں جو بڑے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ شفقت کی بیوی عائشہ ان کی مہمان نوازی میں مصروف تھی۔ جب شفقت صحن میں داخل ہوا تو اس کی بیوی باہر نکلی اور کہنے لگی ''عزیز صاحب کی بیوی اور ان کی لڑکیاں آئی ہیں''۔

شفقت نے ہیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا ''کون عزیز صاحب''۔

عائشہ نے آواز دبا کر جواب دیا ''ہائے آپ کے ابا جی کے دوست!''

''اوہ..... عزیز چچا''۔

''ہاں..... ہاں وہی''۔

شفقت نے ذرا حیرت سے کہا ''مگر وہ تو افریقہ میں تھے''۔

عائشہ نے منہ پر انگلی رکھی ''ذرا آہستہ بات کیجیے۔ آپ تو چلانا شروع کر دیتے ہیں..... وہ افریقہ میں تھے لیکن جو افریقہ میں ہو کیا واپس نہیں آ سکتا''۔

''لو..... اب تم لگیں مین میخ کرنے''۔

''آپ تو لڑنے لگے''۔ عائشہ نے ایک نظر اندر کمرے میں ڈالی ''عزیز صاحب افریقہ ہی میں ہیں لیکن ان کی بیوی اپنی لڑکی شادی کرنے آئی ہیں۔ کوئی اچھا بر ڈھونڈ رہی ہیں''

اندر سے عزیز کی بیوی کی آواز آئی ''عائشہ تم نے روک کیوں لیا شفقت کو..... آنے دو..... آؤ شفقت بیٹا آؤ..... تمہیں دیکھے اتنی مدت ہو گئی ہے''۔

''آیا چچی جان! شفقت نے ہیٹ اسٹینڈ کی کھونٹی پر رکھا اور اندر کمرے میں داخل ہوا۔ ''آداب عرض چچی جان!''۔

عزیز کی بیوی نے اٹھ کر اس کو دعائیں دیں۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھ گئی شفقت بیٹھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ سامنے صوفے پر دو گوری گوری لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ ایک چھوٹی تھی' دوسری بڑی۔ دونوں کی شکل آپس میں ملتی تھی۔ عزیز صاحب بڑے وجیہہ آدمی تھے۔ ان کی یہ وجاہت لڑکیوں میں بڑے دلکش طور پر تقسیم ہوئی تھی۔ آنکھیں ماں کی تھیں۔ نیلی ..... بھال بھورے اور کافی لمبے۔ دونوں کی دو چوٹیاں تھیں چھوٹی کا چہرہ بڑی کے مقابلے میں زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ بڑی کا چہرہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ ان کی ماں ان سے مخاطب ہوئی ''بیٹا سلام کرو بھائی کو''۔

چھوٹی نے اٹھ کر شفقت کو آداب عرض کیا۔ بڑی نے بیٹھے بیٹھے ذرا جھک کر کہا ''تسلیمات''۔

شفقت نے مناسب وموزوں جواب دیا۔ اس کے بعد عزیز صاحب اور افریقہ کے متعلق باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیروبی' تانگھیکا' دارالسلام' کراتینا' یوگنڈا ان سب کی باتیں ہوئی۔ کہاں کا موسم اچھا ہے؟ کہاں کا خراب ہے پھل کہاں اچھے ہوتے ہیں ..... پھلوں کا ذکر چھڑا تو چھوٹی نے کہا ''یہاں ہندوستان میں تو نہایت ہی ذلیل پھل ملتے ہیں''۔

''جی نہیں ..... بڑے اچھے پھل ملتے ہیں۔ بشرطیکہ موسم ہو''۔ شفقت نے اپنے ہندوستان کی آبرو بچانا چاہی۔

''غلط ہے'' چھوٹی نے ناک چڑھائی۔ ''امی جان! یہ جو کل آپ نے مارکیٹ سے مالٹے لیے تھے کیا وہاں کے چنگوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں''۔

لڑکیوں کی ماں بولی ''شفقت بیٹا یہ صحیح کہتی ہے یہاں کے مالٹے وہاں کے چنگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے''۔

عائشہ نے چھوٹی سے پوچھا ''طلعت! یہ چنگا کیا ہوتا ہے..... نام تو بڑا عجیب وغریب ہے''۔

طلعت مسکرائی ''آپا ایک پھل ہے۔ مالٹے اور میٹھے کی طرح..... اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی..... رس..... ایک نچوڑیے..... یہ گلاس جو تپائی پر پڑا ہے لبالب بھر جائے''۔

شفقت نے گلاس کی طرف دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ پھل کتنا بڑا ہوگا۔ ''ایک چنگے سے اتنا بڑا گلاس بھر جاتا ہے''۔

طلعت نے بڑے فخریہ انداز میں کہا ''جی ہاں''۔

شفقت نے یہ سن کر کہا ''تو پھل یقیناً بہت بڑا ہوگا''۔

طلعت نے سر ہلایا ''جی نہیں..... بڑا ہوتا ہے نہ چھوٹا..... بس آپ کے یہاں کے بڑے مالٹے کے برابر ہوتا ہے۔ یہی تو اس کی خوبی ہے کہ رس ہی رس ہوتا ہے اس میں..... اور امان جان وہاں کا اناس..... بڑی روٹی کے برابر اس کی ایک قاش ہوتی ہے''۔

دیر تک اناس کی باتیں ہوتی رہیں۔ طلعت بہت باتونی تھی۔ افریقہ سے اس کو عشق تھا۔ وہاں کی ہر چیز اس کو پسند تھی۔ بڑی جس کا نام نگہت تھا بالکل خاموش

بیٹھی رہی۔ اس نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا۔ شفقت کو جب محسوس ہوا کہ وہ خاموش بیٹھی ہوئی ہے تو وہ اس سے مخاطب ہوا ''آپ غالباً ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں''۔

نگہت نے اپنے ہونٹ کھولے ''جی نہیں..... سنتی رہی ہوں بڑی دلچسپی سے''۔

شفقت نے کہا ''لیکن آپ بولیں نہیں''۔

عزیز کی بیوی نے جواب دیا ''شفقت بیٹا اس کی طبیعت ہی کچھ ایسی ہے''۔

شفقت نے ذرا بے تکلفی سے کہا ''چچی جان..... اس عمر میں لڑکیوں کو خاموش پسند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہو۔'' پھر وہ نگہت سے مخاطب ہوا ''جناب آپ کو بولنا پڑے گا''۔

نگہت کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پیدا ہوئی ''بول تو رہی ہوں بھائی جان!''

شفقت مسکرایا ''تصویروں میں دلچسپی ہے آپ کو''۔

نگہت نے نگاہیں نیچی کر کے جواب دیا ''جی ہے''۔

''تو اٹھیے میں آپ کو البم دکھاؤں..... دوسرے کمرے میں ہے''۔ یہ کہہ کر شفقت اٹھا ''چلیے''۔

عائشہ نے شفقت کا ہاتھ دبایا۔ پلٹ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا جسے شفقت نہ سمجھ سکا۔ وہ متحیر تھا کہ خدا معلوم کیا بات تھی کہ اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ دبایا اور اشارہ

بھی کیا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ طلعت کھٹ سے اٹھی۔ ''چلیے بھائی جان..... مجھے دوسروں کے البم دیکھنے کا بہت شوق ہے..... میرے پاس بھی ایک کولیکشن ہے''۔

شفقت طلعت کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نگہت خاموش بیٹھی رہی۔ شفقت طلعت کو تصویریں دکھاتا رہا حسب عادت طلعت بولتی رہی۔ شفقت کا دماغ کسی اور طرف تھا۔ وہ نگہت کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ اس قدر خاموش کیوں ہے۔ تصویریں دیکھنے اس کے ساتھ کیوں نہ آئی۔ جب اس نے اس کو چلنے کے لیے کہا تو عائشہ نے اس کا ہاتھ کیوں دبایا۔ اس اشارے کا کیا مطلب تھا جو اس نے آنکھوں کے ذریعے کیا تھا۔

تصویریں ختم ہو گئیں۔ طلعت نے البم اٹھایا اور شفقت سے کہا۔ ''باجی کو دکھاتی ہوں۔ ان کو بہت شوق ہے تصویریں جمع کرنے کا''۔

شفقت پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر ان کو شوق ہے تو وہ اس کے ساتھ کیوں نہ آئیں مگر طلعت البم اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ شفقت بڑے کمرے میں داخل ہوا تو نگہت بڑی دلچسپی سے البم کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ ہر تصویر اس کو مسرت پہنچاتی تھی۔

عائشہ لڑکیوں کی ماں سے باتیں کرنے میں مشغول رہی تھی۔ شفقت کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ جو پہلے ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کی دھند میں لپٹا تھا۔ اب بشاش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ تصویریں جو آرٹ کا بہترین نمونہ تھیں اس کو راحت بخش رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں اب چمک تھی۔ لیکن جب ایک گھوڑے اور صحت مند عورت کی تصویر آئی تو یہ چمک ماند پڑ گئی۔ ایک ہلکی سی آہ اس کے سینے

میں لرزی اور وہیں دب گئی۔

تصویریں ختم ہوئیں تو نگہت نے شفقت کی طرف دیکھا اور بڑے پیارے انداز میں کہا ''بھائی جان شکریہ''۔

شفقت نے البم نگہت کے ہاتھ سے لیا اور مینٹل پیس پر رکھ دیا۔ اس کے دماغ میں کھد بد ہو رہی تھی۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ کوئی بہت بڑا اسرار اس لڑکی کی زندگی کے ساتھ ہے۔ اس نے سوچا شاید کوئی نامکمل رومان ہو یا کوئی نفسیاتی حادثہ۔

چائے آئی تو شفقت نگہت سے مخاطب ہوا۔ ''اٹھیے..... چائے بنائیے..... یہ پروجیکٹ لیڈیز کا ہے''۔

نگہت خاموش رہی لیکن طلعت پھدک کر اٹھی ''بھائی جان میں بناتی ہوں''۔

نگہت کا چہرہ پھر دھند میں ملفوف ہو گیا۔ شفقت کا تجسس بڑھتا گیا۔ ایک بار جب اس نے غیر ارادی طور پر نگہت کو گھور کے دیکھا تو وہ سٹپٹا سی گئی۔ شفقت کو دل ہی دل میں اس بات کا افسوس ہوا کہ اس نے کیوں ایسی نازیبا حرکت کی۔

چائے پر ادھر ادھر کی بے شمار باتیں ہوئی۔ طلعت نے ان میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ ٹینس کا ذکر آیا تو اس نے شفقت کو بڑے فخریہ انداز میں جو شیخی کی حد تک جا پہنچا تھا' بتایا کہ وہ نیروبی میں نمبر ون ٹینس پلیئر تھی اور پندرہ بیس کپ جیت چکی تھی۔ نگہت بالکل خاموش رہی اس کی خاموشی بڑی اداس تھی۔ صاف عیاں تھا کہ اس کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ خاموش ہے۔

ایک بات جو شفقت نے خاص طور پر نوٹ کی یہ تھی کہ عزیز کی بیوی کی ممتا کا رخ زیادہ تر نگہت کی طرف تھا۔ اس نے خود اٹھ کر بڑے پیار محبت سے اس کو کریم

رول دیے۔ منہ پونچھنے کے لیے رومال دیا۔ اس سے کوئی بات کرتی تھی تو اس میں پیار بھی ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ باتوں کے ذریعے بھی اس کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیر رہی ہے یا اس کو چمکار رہی ہے۔

رخصت کا وقت آیا تو عزیز کی بیوی اٹھی برقع اٹھایا عائشہ سے گلے ملی۔ شفقت کو دعائیں دیں اور نگہت کے پاس جا کر آنکھوں میں آنسو دلا دینے والے پیار سے کہا ''چلو بیٹا چلیں''۔

طاعت پھدک کر اٹھی۔ عزیز کی بیوی نے نگہت کا ایک بازو تھاما دوسرا بازو طاعت نے پکڑا۔ اس کو اٹھایا گیا۔ شفقت نے دیکھا کہ اس کا نچلا دھڑ بالکل بیجان ہے۔ ایک لحظے کے لیے شفقت کا دل و دماغ ساکت ہو گیا جب وہ سنبھلا تو اسے اپنے اندر ایک ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی۔

لڑکھڑاتی ٹانگوں ماں اور بہن کا سہارا لیے نگہت غیر یقینی قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لے جا کر شفقت اور عائشہ کو آداب عرض کیا۔ کتنا پیارا انداز تھا۔ مگر اس کے ہاتھ نے شفقت کے دل پر جیسے گھونسہ مارا..... سارا اسرار اس پر واضح ہو گیا تھا۔ سب سے پہلا خیال اس کے دماغ میں یہ آیا ''قدرت کیوں اتنی بے رحم ہے..... ایسی پیاری لڑکی اور اس کے ساتھ یہ ظالمانہ اور بہیمانہ سلوک..... اس معصوم کا آخر گناہ کیا تھا۔ جس کی سزا اتنی کڑی دی گئی؟''

سب چلے گئے۔ عائشہ ان کو باہر تک چھوڑنے گئی۔ شفقت ایک فلسفی بن کر سوچتا رہ گیا۔ اتنے میں شفقت کے دوست آ گئے اور وہ بھی اپنی بیوی سے نگہت کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکا..... اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں ایسا

مشغول ہوا کہ نگہت اور اس کے روگ کو بھول گیا۔ جب رات ہوگئی اور عائشہ نے اسے نوکر کے ذریعے سے کھانے پر بلوایا تو اسے افسوس ہوا کہ اس نے محض کھیل کی خاطر نگہت کو فراموش کر دیا۔ چنانچہ اس کا ذکر اس نے عائشہ سے بھی کیا' لیکن اس نے کہا ''آپ کھانے کھایئے مفصل باتیں پھر ہو جائیں گی''۔

میاں بیوی دونوں اکٹھے سوتے تھے۔ جب سے ان کی شادی ہوئی تھی وہ کبھی رات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ اور ان کی شادی کو قریب قریب چھ برس ہو گئے تھے۔ مگر اس دوران میں کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا یہ کہنا تھا کہ عائشہ میں کچھ قصور ہے جو اپریشن سے دور ہو سکتا ہے مگر وہ اس سے بہت خائف تھی۔ میاں بیوی بہت پیار محبت کی زندگی گزار رہے تھے۔ انکے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔

رات کو وہ اکٹھے لیٹتے۔ حسب معمول جب ایک دوسرے کے ساتھ لیٹے تو شفقت کو نگہت کی یاد آئی۔ اس نے ایک آہ بھر کر اپنی بیوی سے پوچھا ''عائشہ نگہت بے چاری کو کیا روگ ہے؟''

عائشہ نے بھی آہ بھری اور بڑے افسوسناک لہجے میں کہا ''تین برس کی ننھی منی بچی تھی کہ تب محرقہ ہوا۔ نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا''۔

شفقت کے دل میں نگہت کے لیے ہمدردی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوا۔

اس نے اپنی بیوی کی پیٹھ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا ''عائشہ کیوں خدا اتنا ظالم ہے؟''

عائشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ شفقت کو دن بھر کے واقعات یاد آنے لگے

''جب میں نے اس سے کہا تھا کہ چلو میں تمہیں البم دکھاتا ہوں تو تم نے میرا ہاتھ اسی لیے دبایا تھا کہ.....''

''ہاں.....ہاں.....اور کیا؟ آپ تو بار بار.....''

''خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں تھا''۔

''اس کو اس کا بہت احساس ہے کہ وہ اپاہج ہے''۔

''تم نے یہ کہا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے سینے میں کسی نے تیر مارا ہے''۔

''جب وہ آئی تو خدا کی قسم مجھے بہت دکھ ہوا..... بے چاری کو پیشاب کرنا تھا۔ماں اور چھوٹی بہن ساتھ گئیں۔ازار بند کھولا.....پھر بند کیا.....

''کتنی خوبصورت ہے.....بیٹھی.....ہو تو خدا کی قسم بالکل پتہ نہیں چلتا کہ فالج زدہ ہے''۔

''بڑی ذہین لڑکی ہے''۔

''اچھا؟''

''ماں کہتی تھی کہ اس نے کہا تھا کہ امی جان میں شادی نہیں کروں گی۔کنواری رہوں گی''۔

شفقت تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔اس کے بعد اس نے انتہائی دکھ محسوس کرتے ہوئے کہا ''تو اس کو اس بات کا احساس ہے کہ اس سے شادی کرنے کے لیے کوئی رضامند نہیں ہوگا''۔

عائشہ نے شفقت کی چھاتی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا

.....''شفقت صاحب کون شادی کرے گا ایک اپاہج سے''۔

''نہیں نہیں ایسا نہ کہو عائشہ''۔

''اتنی بری قربانی کون کر سکتا ہے شفقت صاحب؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو''۔

''خوبصورت ہے' اچھے کھاتے پیتے ماں باپ کی لڑکی ہے..... سب ٹھیک ہے مگر.....''

''میں سمجھتا ہوں..... لیکن.....''

''مردوں کے دل میں رحم کہاں؟''

شفقت نے کروٹ بدلی ''ایسا نہ کہو عائشہ''۔

عائشہ نے بھی کروٹ بدلی۔ دونوں روبرو ہو گئے۔ ''میں سب جانتی ہوں کوئی ایسا مرد ڈھونڈیے جو اس بے چاری سے شادی کرنے پر آمادہ ہو''۔

''مجھے معلوم نہیں لیکن.....''

''بڑی بہن ہے غریب کو کتنا دکھ ہوتا ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کی شادی کی بات چیت ہو رہی ہے''۔

''صحیح کہتی ہو تم''۔

عائشہ نے ایک لمبی آہ بھری ''کیا بے چاری اسی طرح ساری عمر کڑھتی رہے گی''۔

''نہیں'' یہ کہہ کر شفقت اٹھ کر بیٹھ گیا۔

عائشہ نے پوچھا ''کیا مطلب؟''

''تمہیں اس سے ہمدردی ہے؟''

''کیوں نہیں؟''

''خدا کی قسم کھا کر کہو''۔

''ہائے..... یہ بھی کوئی قسم کھلوانے کی بات ہے ہر انسان کو اس سے ہمدردی ہونی چاہیے''۔

شفقت نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد کہا ''تو میں نے ایک بات سوچی ہے''۔

عائشہ نے خوش ہو کر کہا ''کیا؟''

''مجھے ہمیشہ اس بات کا خیال رہا ہے تم بہت بلند خیال عورت ہو۔ آج تم نے میرے اس خیال کو ثابت کر دیا ہے..... میں نے..... خدا میرے اس ارادے کو استقامت بخشے..... میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں نگہت سے شادی کر لوں گا..... سارا ثواب تمہیں ملے گا.....''

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر ایک دم جیسے گولہ پھٹا.....

''شفقت صاحب میں آپ کو گولی مار دوں گی اگر آپ نے اس سے شادی کی.....''

شفقت نے ایسا محسوس کیا کہ اسے زبردست گولی لگی ہے اور وہ مر کر اپنی بیوی کی آغوش میں دفن ہو گیا ہے.....

۲۳ جولائی ۱۹۵۰

☆☆☆

گورمکھ سنگھ کی وصیت

پہلے چھرا بھونکنے کی اکا دکا واردات ہوتی تھی۔ اب دونوں فریقوں میں باقاعدہ لڑائی کی خبریں آنے لگی تھیں جن میں چاقو چھروں کے علاوہ کرپانیں تلواریں اور بندوقیں عام استعمال کی جاتی تھیں کبھی کبھی دیسی ساخت کے بم پھٹنے کی اطلاع بھی ملتی تھی۔

امرتسر میں قریب قریب ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ یہ فرقہ وارانہ فسادات دیر تک جاری نہیں رہیں گے۔ جوش ہے جونہی ٹھنڈا ہوا فضا پھر اپنی اصلی حالت پر آ جائے گی۔ اس سے پہلے ایسی کئی فساد امرتسر میں ہو چکے تھے جو دیرپا نہیں تھے۔ دس پندرہ روز تک مارکٹائی کا ہنگامہ رہتا تھا پھر خود بخود فرو ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پرانے تجربے کی بنا پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ یہ آگ تھوڑی دیر کے بعد اپنا زور ختم کر کے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا..... بلووں کا زور دن بدن بڑھتا ہی گیا۔

ہندوؤں کے محلے میں جو مسلمان رہتے تھے بھاگنے لگے۔ اسی طرح وہ ہندو جو مسلمانوں کے محلے میں تھے اپنا گھر بار چھوڑ کے محفوظ مقاموں کا رخ کرنے لگے۔ مگر یہ انتظام سب کے نزدیک عارضی تھا۔ اس وقت تک کے لیے جب فضا فسادات کے تکدر سے پاک ہو جانے والی تھی۔

میاں عبدالحئی ریٹائرڈ سب جج کو تو سو فیصدی یقین تھا کہ صورت حال بہت جلد درست ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہیں تھے ان کا ایک لڑکا تھا گیارہ برس کا۔ ایک لڑکی تھی سترہ برس کی۔ ایک پرانا ملازم تھا جس کی عمر ستر کے

لگ بھگ تھی مختصر سا خاندان تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو میاں صاحب نے بطور حفظ ماتقدم کافی راشن گھر میں جمع کر لیا تھا۔ اس طرف سے وہ بالکل مطمئن تھے کہ اگر خدانخواستہ حالات کچھ زیادہ بگڑ گئے اور دکانیں وغیرہ بند ہو گئیں تو انہیں کھانے پینے کے معاملے میں تردد نہیں کرنا پڑے گا لیکن ان کی جوان لڑکی صغریٰ بہت متردد تھی۔ ان کا گھر تین منزلہ تھا۔ دوسری عمارتوں کے مقابلے میں کافی اونچا۔ اس کی چھت سے شہر کا تین چوتھائی حصہ بخوبی نظر آتا تھا۔ صغریٰ اب کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ نزدیک دور کہیں نہ کہیں آگ لگی ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن سنائی دیتی تھی پر اب وہ بھی بند ہو گئی تھی اس لیے کہ جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگی تھی۔

رات کو اب کچھ اور ہی سماں ہوتا۔ گھپ اندھیرے میں آگ کے بڑے بڑے شعلے اٹھتے جیسے دیو ہیں جو اپنے منہ سے آگ کے فوارے چھوڑ رہے ہیں۔ پھر عجیب عجیب سی آوازیں آتیں جو ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعرے کے ساتھ مل کر بہت ہی وحشت ناک بن جاتیں۔

صغریٰ باپ سے اپنے خوف و ہراس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک بار گھر میں کہہ چکے تھے کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میاں صاحب کی باتیں اکثر درست ہوا کرتی تھیں۔ صغریٰ کو اس سے ایک گونہ اطمینان تھا۔ مگر جب بجلی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ساتھ ہی نلوں کا پانی آنا بند ہو گیا تو اس نے میاں صاحب سے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ڈرتے ڈرتے رائے دی تھی کہ چند روز کے لیے شریف پورے اٹھ جائیں جہاں اڑوس پڑوس کے سارے

مسلمان آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ میاں صاحب نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور کہا ''بیکار گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں حالات بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے''۔

مگر حالات بہت جلدی ٹھیک نہ ہوئے اور دن بدن بگڑتے گئے۔ وہ محلّہ جس میں میاں عبدالحیٔ کا مکان تھا مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میاں صاحب پر ایک روز اچانک فالج گرا جس کے باعث وہ صاحب فراش ہو گئے۔ ان کا لڑکا بشارت بھی جو پہلے گھر میں اکیلا گھر میں اوپر نیچے طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف رہتا تھا اب باپ کی چارپائی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور حالات کی نزاکت کو سمجھنے لگا۔

وہ بازار جوان کے مکان کیساتھ ملحق تھا سنسان پڑا تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی ڈسپنسری مدت سے بند پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر ڈاکٹر گوراند تامل تھے۔ صغریٰ نے شہ نشین سے دیکھا تھا کہ ان کی دکان میں بھی تالے پڑے ہیں۔ میاں صاحب کی حالت بہت ہی مخدوش تھی۔ صغریٰ اس قدر پریشان تھی کہ اس کے ہوش وحواس بالکل جواب دے گئے تھے۔ بشارت کو الگ لے جا کر اس نے کہا ''خدا کے لیے تم ہی کچھ کرو میں جانتی ہوں کہ باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں مگر تم جاؤ..... کسی کو بھی بلا لاؤ ابا جی کی حالت بہت خطرناک ہے''۔

بشارت گیا مگر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چوک میں اس نے ایک لاش دیکھی تھی۔ خون سے تر بتر..... اور پاس ہی بہت سے آدمی ٹھاٹے باندھے ایک دکان لوٹ رہے تھے۔ صغریٰ نے اپنے خوفزدہ بھائی کو اپنے سینے سے لگایا اور صبر شکر کر کے بیٹھ گئی۔ مگر اس سے اپنے باپ کی حالت دیکھی نہیں

جاتی تھی۔ میاں صاحب کے جسم کا داہنا حصہ بالکل سن ہو گیا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ گویائی میں بھی فرق پڑ گیا تھا اور وہ زیادہ تر اشاروں ہی سے باتیں کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ صغریٰ گھبرانے کی کوئی بات نہیں خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کچھ بھی ٹھیک نہ ہوا۔ روزے ختم ہونے والے تھے۔ صرف دو رہ گئے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ عید سے پہلے پہلے فضا بالکل صاف ہو جائے گی مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید عید ہی کا روز روز قیامت ہو کیونکہ ممٹی پر سے اب شہر کے قریب قریب ہر حصے سے دھوئیں کے بادل اٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ رات کو بم پھٹنے کی ایسی ہولناک آوازیں آتی تھیں کہ صغریٰ اور بشارت ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکتے تھے۔ صغریٰ کو تو یوں بھی باپ کی تیمارداری کے لیے جاگنا پڑتا تھا۔ مگر اب یہ دھماکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ کے اندر ہو رہے ہیں۔ کبھی وہ اپنے مفلوج باپ کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنے وحشت زدہ بھائی کی طرف..... ستر برس کا ایک بڈھا ملازم اکبر تھا جس کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات پڑا اپنی کوٹھڑی میں کھانستا کھنکھارتا اور بلغم نکالتا رہتا تھا۔ ایک روز تنگ آ کر صغریٰ اس پر برس پڑی "تم کس مرض کی دوا ہو۔ دیکھتے نہیں ہو میاں صاحب کی کیا حالت ہے۔ اصل میں تم پرلے درجے کے نمک حرام ہو۔ اب خدمت کا موقع آیا ہے تو دمے کا بہانہ کر کے یہاں پڑے رہتے ہو..... وہ بھی خادم تھے جو آقا کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے"۔

صغریٰ اپنا جی ہلکا کر کے چلی گئی۔ بعد میں افسوس ہوا کہ ناحق اس غریب کو اتنی

لعنت ملامت کی۔ رات کا کھانا تھال میں لگا کر اس کی کوٹھڑی میں گئی تو دیکھا خالی ہے بشارت نے ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ باہر کے دروازے کی کنڈی کھلی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ میاں صاحب کے لیے کچھ کرنے گیا ہے۔ صغریٰ نے بہت دعائیں مانگیں کہ خدا اسے کامیاب کرے لیکن دو دن گزر گئے اور وہ نہ آیا۔

شام کا وقت تھا۔ ایسی کئی شامیں صغریٰ اور بشارت دیکھ چکے تھے جب عید کی آمد آمد کے ہنگامے برپا ہوتے تھے۔ جب آسمان پر چاند دیکھنے کے لیے ان کی نظریں جمی رہتی تھیں۔ دوسرے روز عید تھی۔ صرف چاند کو اس کا اعلان کرنا تھا۔ دونوں اس اعلان کے لیے کتنے بے تاب ہوا کرتے تھے۔ آسمان پر چاند والی جگہ پر اگر بادل کا کوئی ہٹیلا ٹکڑا جم جاتا تو کتنی کوفت ہوتی تھی انہیں مگر اب چاروں طرف دھوئیں کے بادل تھے۔ صغریٰ اور بشارت دونوں ممٹی پر چڑھے۔ دور کہیں کہیں کوٹھوں پر لوگوں کے سایے دھبوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے۔ مگر معلوم نہیں یہ چاند کو دیکھ رہے تھے یا جگہ جگہ سلگتی اور بھڑکتی ہوئی آگ۔

چاند بھی کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ دھوئیں کی چادر میں سے بھی نظر آ گیا۔ صغریٰ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خدا اپنا فضل کرے اور اس کے باپ کو تندرستی عطا فرمائے۔ بشارت دل ہی دل میں کوفت محسوس کر رہا تھا کہ گڑبڑ کے باعث ایک اچھی بھلی عید غارت ہو گئی۔

دن ابھی پوری طرح ڈھلا نہیں تھا۔ یعنی شام کی سیاہی ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کی چارپائی چھڑکاؤ کیے ہوئے صحن میں بچھی تھی۔ وہ اس پر بے حس

وحرکت لیٹے تھے اور دور آسمان پر نگاہیں جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ عید کا چاند دیکھ کر جب صغریٰ نے پاس آ کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے اشارے سے جواب دیا۔ صغریٰ نے سر جھکایا تو انہوں نے وہ بازو جو ٹھیک تھا اٹھایا اور اس پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ صغریٰ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تو میاں صاحب کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں مگر انہوں نے تسلی دینے کی خاطر بمشکل اپنی نیم مفلوج زبان سے یہ الفاظ نکالے ''اللہ تبارک وتعالیٰ سب ٹھیک کر دے گا''۔

عین اسی وقت باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ صغریٰ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے بشارت کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میاں صاحب صغریٰ سے مخاطب ہوئے ''دیکھو کون ہے''۔

صغریٰ نے سوچا شاید بڈھا اکبر ہو۔ اسی خیال میں اس کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔ بشارت کا بازو پکڑ کر اس نے کہا ''جاؤ دیکھو..... شاید اکبر آیا ہے''۔

یہ سن کر میاں صاحب نے نفی میں یوں سر ہلایا جیسے وہ یہ کہہ رہے ہیں ''نہیں یہ اکبر نہیں ہے''۔

صغریٰ نے کہا ''تو اور کون ہو سکتا ہے ابا جی!''

میاں عبدالحیٔ نے اپنی قوت گویائی پر زور دے کر کچھ کہنے کی کوشش کی کہ بشارت آ گیا وہ سخت خوفزدہ تھا۔ ایک سانس اوپر ایک نیچے صغریٰ کو میاں صاحب کی چارپائی سے ایک طرف ہٹا کر اس نے ہولے سے کہا ''ایک سکھ ہے''۔

صغریٰ کی چیخ نکل گئی ''سکھ؟..... کیا کہتا ہے؟''

بشارت نے جواب دیا ''کہتا ہے دروازہ کھولو''۔

صغریٰ نے کانپتے ہوئے بشارت کو کھینچ کر اپنے ساتھ چمٹا لیا اور باپ کی چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف ویران نظروں سے دیکھنے لگی۔

میاں عبدالحئی کے پتلے پتلے بے جان ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ''جاؤ گورمکھ سنگھ ہے''۔

بشارت نے نفی میں سر ہلا دیا ''نہیں کوئی اور ہے''۔

میاں صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا ''جاؤ صغریٰ وہی ہے''۔

صغریٰ اٹھی۔ وہ گورمکھ سنگھ کو جانتی تھی۔ پنشن لینے سے کچھ دیر پہلے اس کے باپ نے اس نام کے ایک سکھ کا کوئی کام کیا تھا۔ صغریٰ کو اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ شاید اس کو ایک جھوٹے مقدمے سے نجات دلائی تھی۔ جب سے وہ ہر چھوٹی عید سے ایک دن پہلے رومالی سویوں کا ایک تھیلا لے کر آیا کرتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا۔ ''سردار جی آپ تکلف نہ کیا کریں''۔ مگر وہ ہاتھ جوڑ کر جواب دیا کرتا تھا ''میاں صاحب واہگورو جی کی کرپا سے آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ یہ تو ایک تحفہ ہے جو میں جناب کی خدمت میں ہر سال لے کر آتا ہوں۔ مجھ پر جو آپ نے احسان کیا تھا اس کا بدلہ تو میری سو پشت بھی نہیں چکا سکتی..... خدا آپ کو خوش رکھے''۔

سردار گورمکھ سنگھ کو ہر سال عید سے ایک روز پہلے سویوں کا تھیلا لاتے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ صغریٰ کو حیرت ہوئی کہ اس نے دستک سن کر یہ کیوں خیال نہ کیا کہ وہی ہو گا' مگر بشارت بھی تو اس کو سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا تھا' پھر اس نے کیوں کہا کوئی

اور ہے..... اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ سوچتی صغریٰ ڈیوڑھی تک پہنچی۔ دروازہ کھولے یا اندر ہی سے پوچھے' اس کے متعلق ابھی وہ فیصلہ ہی کر رہی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ صغریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بمشکل تمام اس نے حلق سے آواز نکالی ''کون ہے؟''

بشارت پاس کھڑا تھا۔ اس نے دروازے کی ایک درز کی طرف اشارہ کیا۔ اور صغریٰ سے کہا ''اس میں سے دیکھو''۔

صغریٰ نے درز میں سے دیکھا۔ گورمکھ سنگھ نہیں تھا وہ تو بہت بوڑھا تھا لیکن یہ جو باہر تھڑے پر کھڑا تھا جوان تھا۔ صغریٰ ابھی درز پر آنکھ جمائے اس کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ صغریٰ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک تھیلا ہے ویسا ہی جیسا گورمکھ سنگھ لایا کرتا تھا۔

صغریٰ نے درز سے آنکھ ہٹائی اور ذرا بلند آواز میں دستک والے سے پوچھا ''کون ہیں آپ؟''

باہر سے آواز آئی ''جی..... جی میں..... میں سردار گورمکھ سنگھ کا بیٹا ہوں..... سنتوکھ''۔

صغریٰ کا خوف بہت حد تک دور ہو گیا۔ بڑی شائستگی سے اس نے پوچھا ''فرمایئے..... آپ کیسے آئے ہیں''۔

باہر سے آواز آئی ''جی..... جج صاحب کہاں ہیں''۔

صغریٰ نے جواب دیا ''بیمار ہیں''

سردار سنتوکھ سنگھ نے افسوس آمیز لہجے میں کہا ''اوہ..... پھر اس نے کاغذ کا

تھیلا کھڑ کھڑایا ''جی یہ سویاں ہیں..... سردار جی کا دیہانت ہو گیا ہے..... وہ مر گئے ہیں''۔

صغریٰ نے جلدی سے پوچھا ''مر گئے ہیں''۔

باہر سے آواز آئی ''جی ہاں..... ایک مہینہ ہو گیا ہے..... مرنے سے پہلے انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ دیکھو بیٹا! میں جج صاحب کی خدمت میں پورے دس برس سے ہر چھوٹی عید پر سویاں لے جاتا رہا ہوں..... یہ کام میرے مرنے کے بعد اب تمہیں کرنا ہو گا..... میں نے انہیں وچن دیا تھا۔ جو میں پورا کر رہا ہوں..... لے لیجیے سویاں''۔

صغریٰ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ سردار گورمکھ سنگھ کے لڑکے نے سویوں کا تھیلا آگے بڑھا دیا جو صغریٰ نے پکڑ لیا اور کہا ''خدا سردار جی کو جنت نصیب کرے''۔

گورمکھ سنگھ کا لڑکا کچھ توقف کے بعد بولا ''جج صاحب بیمار ہیں''۔

صغریٰ نے جواب دیا ''جی ہاں''۔

''کیا بیماری ہے؟''

''فالج''۔

''اوہ سردار جی زندہ ہوتے تو انہیں یہ سن کر بہت دکھ ہوتا..... مرتے دم تک انہیں جج صاحب کا احسان یاد تھا۔ کہتے تھے وہ انسان نہیں دیوتا ہیں..... اللہ میاں انہیں زندہ رکھے..... انہیں میرا سلام کہنا''۔

اور یہ کہہ کر وہ تھڑے سے اتر گیا..... صغریٰ سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ اسے ٹھہرائے

اور کہے کہ جج صاحب کے لیے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر دے۔

سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا سنتوکھ جج صاحب کے مکان کے تھڑے سے اتر کر چند گز آگے بڑھا تو چار ٹھاٹا باندھے ہوئے آدمی اس کے پاس آئے دو کے پاس جلتی مشعلیں تھیں اور دو کے پاس مٹی کے تیل کے کنستر اور کچھ دوسری آتش خیز چیزیں۔ ایک نے سنتوکھ سے پوچھا ''کیوں سردار جی اپنا کام کر آئے؟''

سنتوکھ نے سر ہلا کر جواب دیا ''ہاں کر آیا''۔

اس آدمی نے ٹھاٹے کے اندر ہنس کر پوچھا ''تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج صاحب کا''۔

''ہاں..... جیسے تمہاری مرضی''۔ یہ کہہ کر سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء

☆☆☆

لال ٹین

میرا قیام ''بٹوت'' میں گو مختصر تھا لیکن گوناگوں روحانی مسرتوں سے پر۔ میں نے اس کی صحت افزا فضا میں جتنے دن گزارے ہیں ان کی ہر لمحہ کی یاد میرے ذہن کا ایک جزو بن کے رہ گئی ہے۔ جو بھلائے نہ بھولے گی..... کیا دن تھے..... بار بار میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بلند ہوتی ہے اور میں کئی کئی گھنٹے اس کے زیر اثر بے خود و مدہوش رہتا ہوں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ انسان اپنی گزشتہ زندگی کے کھنڈروں پر مستقبل کی دیواریں استوار کرتا ہے۔ ان دنوں میں بھی یہی کر رہا ہوں یعنی بیتے ہوئے ایام کی یاد کو اپنی مضمحل رگوں میں زندگی بخش انجکشن کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

جو کل ہوا تھا اسے اگر آج دیکھا جائے تو اس کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ نظر آئے گا اور جو کل ہونا ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں۔ آج سے پورے چار مہینے کی طرف دیکھا جائے تو بٹوت میں میری زندگی ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا افسانہ جس کا مسودہ صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنا دوسرے انسانوں کی طرح میرے بس میں بھی نہیں۔ جب میں استقبال کے آئینہ میں اپنی آنے والی زندگی کا عکس دیکھنا چاہتا ہوں تو اس میں مجھے حال ہی کی تصویر نظر آتی ہے اور کبھی کبھی اس تصویر کے پس منظر میں ماضی کے دھندلے نقوش نظر آجاتے ہیں۔ ان میں بعض نقش اس قدر تیکھے اور شوخ رنگ ہیں کہ شاید ہی انہیں زمانہ کا ہاتھ مکمل طور پر مٹا سکے۔

زندگی کے اس کھوئے ہوئے ٹکڑے کو میں اس وقت زمانہ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں جو شریر بچے کی طرح مجھے بار بار اس کی جھلک دکھا کر اپنی پیٹھ پیچھے چھپا لیتا ہے..... اور میں اس کھیل ہی سے خوش ہوں۔ اس کو غنیمت سمجھتا ہوں۔

ایسے واقعات کو جن کی یاد میرے ذہن میں اب تک تازہ ہے میں عام طور پر دہراتا رہتا ہوں تاکہ ان کی تمام شدت برقرار رہے اور اس غرض کے لیے میں کئی طریقے استعمال کرتا ہوں۔ بعض اوقات میں یہ بیتے ہوئے واقعات اپنے دوستوں کو سنا کر اپنا مطلب حل کر لیتا ہوں۔ اگر آپ کو میرے ان دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہو تو وہ آپ سے یقیناً یہی کہیں گے کہ میں قصہ گوئی اور آپ بیتیاں سنانے کا بالکل سلیقہ نہیں رکھتا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ داستان سنانے کے دوران مجھے سامعین کے تیوروں سے ہمیشہ اس بات کا احساس ہوا ہے کہ میرا بیان غیر مربوط ہے اور میں جانتا ہوں کہ چونکہ میری داستان ہمواری کم اور جھٹکے زیادہ ہوتے ہیں اس لیے میں اپنے محسوسات کو اچھی طرح کسی کے دماغ میں منتقل نہیں کر سکتا اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میں ایسا ہی کر سکوں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میں اکثر اوقات اپنی داستان سناتے سناتے جب ایسے مقام پر پہنچتا ہوں جس کی یاد میرے ذہن میں موجود نہ تھی اور وہ خیالات کی رو میں خود بخود بہہ کر چلی آئی تھی تو میں غیر ارادی طور پر اس نئی یاد کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہوں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے بیان کا تسلسل یک لخت منتشر ہو جاتا ہے اور جب میں ان گہرائیوں سے نکل کر داستان کے ٹوٹے ہوئے دھاگے کو جوڑنا چاہتا ہوں تو عجلت میں وہ ٹھیک طور سے نہیں جڑتا۔

کبھی کبھی میں یہ داستانیں رات کو سوتے وقت اپنے ذہن میں زبانی خود سنتا ہوں لیکن اس دوران میں مجھے بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ میرے ذہن کی زبان بہت تیز ہے اور اس کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات اتنی تفصیل کے ساتھ خود بخود بیان ہونا شروع ہو جاتے ہیں کہ طبیعت اکتا جاتی ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کسی دوسرے واقعہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے اور اس کا احساس کسی دوسرے احساس کو اپنے ساتھ لے آتا ہے اور پھر احساسات و افکار کی بارش زوروں پر شروع ہو جاتی ہے اور اتنا شور مچتا ہے کہ نیند حرام ہو جاتی ہے۔ جس روز صبح کو میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آئیں آپ سمجھ لیا کریں کہ ساری رات میں اپنے ذہن کی قصہ گوئی کا شکار رہا ہوں۔

جب مجھے کسی بیتے ہوئے واقعہ کو اس کی تمام شدتوں سمیت محفوظ کرنا ہوتا ہے تو میں قلم اٹھاتا ہوں اور کسی گوشے میں بیٹھ کر کاغذ پر اپنی زندگی کی اس ٹکڑے کی تصویر کھینچ دیتا ہوں یہ تصویر بھدی ہوتی ہے یا خوبصورت اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے ادبی نقاد میری ان قلمی تصویروں کے متعلق کیا رائے مرتب کرتے ہیں۔ دراصل مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اگر میری تصویر کشی سقیم اور خام ہے تو ہوا کرے مجھے اس سے کیا اور اگر یہ ان کے مقرر کردہ معیار پر پوری اترتی ہے تو بھی مجھے اس سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ میں یہ کہانیاں صرف اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے۔ جس طرح عادی شراب خور دن ڈھلے شراب خانہ کا رخ کرتا ہے ٹھیک اسی طرح میری

انگلیاں بے اختیار قلم کی جانب بڑھتی ہیں اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ میرا روئے سخن یا تو اپنی طرف ہوتا ہے یا ان چند افراد کی طرف جو میری تحریروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں ادب سے دور اور زندگی سے نزدیک تر ہوں۔

زندگی..... زندگی!..... آہ زندگی!!

میں زندگی زندگی پکارتا ہوں مگر مجھ میں زندگی کہاں؟ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنی عمر کی پٹاری کھول کر اس کی ساری چیزیں باہر نکالتا ہوں اور جھاڑ پونچھ کر بڑے قرینے سے ایک قطار میں رکھتا ہوں اور اس آدمی کی طرح جس کے گھر میں تھوڑا سامان ہو ان کی نمائش کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے اپنا یہ فعل برا معلوم ہوتا ہے لیکن میں کیا کروں۔ مجبور ہوں۔ میرے پاس اگر زیادہ نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر مجھ میں سفلہ پن پیدا ہو گیا ہے تو اس کا ذمہ دار میں کیسے ہو سکتا ہوں۔ میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے۔ دنیا میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی زندگی چٹیل میدان کی طرح خشک ہے اور میری زندگی کے ریگستان پر تو ایک بار بارش ہو چکی ہے۔

گو میرا شباب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے مگر میں ان دنوں کی یاد پر جی رہا ہوں جب میں جوان تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سہارا کبھی کسی روز جواب دے جائے گا اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا میں بتا نہیں سکتا لیکن اپنے موجودہ انتشار کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا انجام چشم فلک کو بھی نمناک کر دے گا۔ آہ! خرابہ فکر کا انجام۔

وہ شخص جسے انجام کار اپنے وزنی افکار کے نیچے پس جانا ہے یہ سطور لکھ رہا ہے

اور مزے کی بات ہے کہ وہ ایسی اور بہت سی سطریں لکھنے کی تمنا اپنے دل میں رکھتا ہے۔

میں ہمیشہ مغموم وملول رہا ہوں لیکن شبیر جانتا ہے کہ بوٹ میں میری آہوں کی زردی اور تپش کے ساتھ ساتھ ایک خوش گوار مسرت کی سرخی اور ٹھنڈک بھی تھی۔ وہ آب و آتش کے اس باہمی ملاپ کو دیکھ کر متعجب ہوتا تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے اس کی نگاہوں میں میرے وجود کو ایک معمہ بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کوشش میں وہ میرے قریب بھی آ جاتا تھا۔ مگر دفعتاً کوئی ایسا حادثہ وقوع پذیر ہوتا جس کے باعث اسے پھر پرے ہٹنا پڑتا تھا اور اس طرح وہ نئی شدت سے مجھے پراسرار اور کبھی پر تصنع انسان سمجھنے لگتا۔

اکرم صاحب حیران تھے کہ بوٹ جیسی غیر آباد اور غیر دلچسپ دیہات میں پڑے رہنے سے میرا کیا مقصد ہے۔ وہ ایسا کیوں سوچتے تھے؟ اس کی وجہ میرے خیال میں صرف یہ ہے کہ ان کے پاس سوچنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اسی مسئلے پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔

وزیر کا گھر ان کے بنگلے کے سامنے بلند پہاڑی پر تھا اور جب انہوں نے اپنے نوکر کی زبانی یہ سنا کہ میں اس پہاڑی لڑکی کے ساتھ پہروں باتیں کرتا رہتا ہوں تو انہوں نے یہ سمجھا کہ میری دکھتی ہوئی رگ ان کے ہاتھ آ گئی ہے اور انہوں نے ایک ایسا راز معلوم کر لیا ہے جس کے افشا پر تمام دنیا کے دروازے مجھ پر بند ہو جائیں گے۔ لوگوں سے وہ جب اس مسئلے پر باتیں کرتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے کہ میں تعیش پسند ہوں اور ایک بھولی بھالی لڑکی کو پھانس رہا ہوں اور ایک بار جب

انہوں نے مجھ سے بات کی تو کہا۔ دیکھیے یہ پہاڑی لونڈیا بڑی خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو آپ اس کے جال میں پھنس جائیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں یا کسی اور کو میرے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وزیر کا کریکٹر بہت خراب تھا اور میرا کریکٹر بھی کوئی خاص اچھا نہیں تھا لیکن سوال یہ ہے کہ لوگ کیوں میری فکر میں مبتلا تھے اور پھر جو ان کے من میں تھا صاف صاف کیوں نہیں کہتے تھے۔ وزیر پر میرا کوئی حق نہیں تھا اور نہ وہ میرے دباؤ میں تھی۔ اکرام صاحب یا کوئی اور صاحب اگر اس سے دوستانہ ماحول پیدا کرنا چاہتے تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ دراصل ہماری تہذیب و معاشرت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ عام طور پر صاف گوئی کو معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ کھل کر بات ہی نہیں کی جاتی اور کسی کے متعلق اگر اظہار خیال کیا بھی جاتا ہے تو غلاف چڑھا کر۔

میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور اس پہاڑی لونڈیا سے جسے بڑا خطرناک کہا جاتا تھا اپنی دلچسپی کا اعتراف کیا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اپنے دل کی آواز کو دل ہی میں دبا کر رکھنے کے عادی تھے اس لیے میری سچی باتیں ان کو بالکل جھوٹی معلوم ہوئیں اور ان کا شک بدستور قائم رہا۔

میں انہیں کیسے یقین دلاتا کہ میں اگر وزیر میں دلچسپی لیتا ہوں تو اس کا باعث یہ ہے کہ میرا ماضی و حال تاریک ہے۔ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ اسی لیے میں اس سے زیادہ وابستہ تھا۔ وزیر سے میری دلچسپی اس محبت کا ریہرسل تھی جو میرے دل میں اس عورت کے لیے موجود ہے جو ابھی میری زندگی میں نہیں آئی۔ میری

زندگی کی انگوٹھی میں وزیر ایک چھوٹا سا نگینہ تھی لیکن یہ نگینہ مجھے بڑا عزیز تھا اس لیے اس کی تراش خراش اس کا ماپ بالکل اس اصلی نگینہ کے مطابق تھا جس کی تلاش میں میں ہمیشہ ناکام رہا ہوں۔

وزیر سے میری دل بستگی بے غرض نہیں تھی اس لیے میں غرض مند تھا وہ شخص جو اپنے غم افزا ماحول کو کسی کے وجود سے رونق بخشنا چاہتا ہو اس سے زیادہ خود غرض اور کون ہو سکتا ہے؟ اس لحاظ سے میں وزیر کا ممنون بھی تھا اور خدا گواہ ہے کہ میں جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار میرا دل اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

شہر میں مجھے صرف ایک کام تھا..... اپنے ماضی حال اور مستقبل کے گھپ اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنا اور بس..... مگر بوت میں اس تاریکی کے اندر روشنی کی ایک شعاع تھی وزیر کی لال ٹین!

بھٹیارے کے ہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور شبیر ٹہلتے ٹہلتے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتے۔ یہ بنگلہ ہوٹل سے قریباً تین جریب کے فاصلے پر تھا۔ رات کی خنک اور نیم مرطوب ہوا میں اس چہل قدمی کا بہت لطف آتا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں پہاڑیوں اور ڈھلوانوں پر مکئی کے کھیت رات کے دھندلکے میں خاکستری رنگ کے بڑے بڑے قالین معلوم ہوتے تھے اور جب ہوا کے جھونکے مکئی کے پودوں میں لرزش پیدا کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے بہت سی پریاں ان قالینوں پر اتر آئی ہیں اور ہولے ہولے ناچ رہی ہیں۔

آدھا راستہ طے کرنے پر جب ہم سڑک کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹے سے دو منزلہ چوبی مکان کے قریب پہنچتے تو شبیر اپنے مخصوص دھن میں یہ شعر گاتا:

ہر قدم فتنہ ہے قیامت ہے

آسمان تیری چال کیا جانے

یہ شعر گانے کی ایک خاص وجہ تھی۔ اس چوبی مکان کے رہنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میرے اور وزیر کے تعلقات اخلاقی نقطہ نگاہ سے ٹھیک نہیں تھے حالانکہ وہ اخلاق کے معانی سے بالکل نا آشنا تھے۔ یہ لوگ مجھ سے اور شبیر سے بہت دلچسپی لیتے تھے اور میری نقل وحرک پر خاص طور پر نگرانی کرتے تھے، وہ تفریح کی غرض سے بہوت آئے ہوئے تھے اور انہیں تفریح کا کافی سامان مل گیا تھا۔ شبیر اوپر والا شعر گا کر ان کی تفریح میں مزید اضافہ کیا کرتا تھا۔ اس کو چھیڑ چھاڑ میں خاص لطف آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی رہائش گاہ کے عین سامنے پہنچ کر اس کو یہ شعر یاد آجاتا تھا اور وہ فوراً اسے بلند آواز میں گایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔

یہ شعر کسی خاص واقعے یا تاثر کے متعلق نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے صرف یہی شعر یاد تھا یا ہو سکتا ہے کہ وہ صرف اسی شعر کو گا سکتا تھا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ بار بار یہی شعر دہراتا۔

شروع شروع میں اندھیری راتوں میں سنسان سڑک پر ہماری چہل قدمی چوبی مکان کے چوبی ساکنوں پر (وہ غیر معمولی طور پر اجڈ اور گنوار واقع ہوئے تھے) کوئی اثر پیدا نہ کر سکی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد ان کے بالائی کمرے میں روشنی نظر آنے لگی اور وہ ہماری آمد کے منتظر رہنے لگے اور جب ایک روزان میں سے ایک نے اندھیرے میں ہمارا رخ معلوم کرنے کے لیے بیٹری روشن کی تو میں نے

شبیر سے کہا ''آج ہمارا رومان مکمل ہو گیا ہے''۔ مگر میں نے دل میں ان لوگوں کی قابل رحم حالت پر بہت افسوس کیا' کیونکہ وہ بیکار دو دو تین تین گھنٹے جاگتے رہتے تھے۔

حسب معمول ایک رات شبیر نے اس مکان کے پاس پہنچ کر شعر گایا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ بیٹری کی روشنی حسب معمول چمکی اور ہم باتیں کرتے ہوئے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے ہو کا عالم تھا ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی آسمان ہم پر مرتبان کی طرح جھکا ہوا تھا۔ اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہم کسی بوتل میں چل پھر رہے ہیں۔ سکوت اپنی آخری حد تک پہنچ کر متکلم ہو گیا تھا۔

بنگلے کے باہر برآمدے میں ایک چھوٹی سی میز پر لیمپ جل رہا تھا اور پاس ہی پلنگ پر اکرام صاحب لیٹے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ شبیر نے دور سے ان کی طرف دیکھا اور دفعتاً سادھوؤں کا مخصوص نعرہ مستانہ ''الکھ نرنجن'' بلند کیا۔ اس غیر متوقع شور نے مجھے اور اکرام صاحب دونوں کو چونکا دیا۔ شبیر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پھر ہم دونوں برآمدے میں داخل ہو کر اکرام صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔ میرا منہ سڑک کی جانب تھا۔ عین اس وقت جب میں نے حقہ کی نے منہ میں دبائی مجھے سامنے سڑک کے اوپر تاریکی میں روشنی کی ایک جھلک دکھائی دی۔ پھر ایک متحرک سایہ نظر آیا اور اس کے بعد روشنی ایک جگہ ساکن ہو گئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وزیر کا بھائی اپنے کتے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ چنانچہ ادھر دیکھنا چھوڑ کر میں شبیر اور اکرام صاحب کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول ہو گیا۔

دوسرے روز شبیر کے نعرہ بلند کرنے کے بعد پھر اخروٹ کے درخت کے عقب میں روشنی نمودار ہوئی اور سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ تیسرے روز بھی ایسا ہوا۔ چوتھے روز صبح کو میں اور شبیر چشمے پر غسل کو جا رہے تھے کہ اوپر سے ایک کنکر گرا میں نے اور شبیر نے بیک وقت سڑک کے اوپر جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ وزیر سر پر پانی کا گھڑا اٹھائے ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی اور شبیر سے کہنے لگی ''کیوں جناب آپ نے کیا وتیرہ اختیار کیا ہے کہ ہر روز ہماری نیند خراب کریں''۔

شبیر حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں وزیر کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

شبیر نے اس سے کہا ''آج آپ پہیلیوں میں بات کر رہی ہیں''۔

وزیر نے سر پر گھڑے کا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''میں اتنی اتنی دیر تک لال ٹین جلا کر اخروٹ کے نیچے بیٹھی رہتی ہوں اور آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ پھوٹے منہ سے شکریہ ہی ادا کر دیں۔ بھلا آپ کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے..... یہ چوکیداری تو میرے ہی ذمے ہے..... آپ ٹہلنے کو نکلیں اور اکرام صاحب کے بنگلے میں گھنٹوں باتیں کرتے رہیں اور میں لال ٹین لیے اونگھتی رہوں''۔

شبیر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ بھئی میں تو کچھ نہ سمجھا' یہ کس دھن میں الاپ رہی ہیں؟''

میں نے شبیر کو جواب نہ دیا اور وزیر سے کہا ''ہم کئی دنوں سے رات گئے اکرام صاحب کے یہاں آتے ہیں۔ دو تین مرتبہ میں نے اخروٹ کے پیچھے تمہارے

لال ٹین دیکھی پر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم خاص ہمارے لیے آتی ہو..... اس کی کیا ضرورت ہے..... تم ناحق اپنی نیند کیوں خراب کرتی ہو؟"

وزیر نے شبیر کو مخاطب کر کے کہا" آپ کے دوست بڑے ہی ناشکرے ہیں ایک تو میں ان کی حفاظت کروں اور اوپر سے یہی مجھ پر اپنا احسان جتائیں۔ ان کو اپنی جان پیاری نہ ہو....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور بات کا رخ یوں بدل دیا "آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں ان کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر آپ انہیں کیوں نہیں سمجھاتے کہ رات کو باہر نہ نکلا کریں"۔

وزیر کو واقعی میری بہت فکر تھی۔ بعض اوقات وہ مجھے بالکل بچہ سمجھ کر میری حفاظت کی تدبیریں سوچا کرتی تھی جیسے وہ خود محفوظ و مامون ہے اور میں بہت سی بلاؤں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں نے اسے کبھی نہ ٹوکا تھا اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اسے اس شغل سے باز رکھوں جس سے وہ لطف اٹھاتی ہے اس کی اور میری حالت ایک جیسی تھی ہم دونوں ایک ہی منزل کی طرف جانے والے مسافر تھے جو ایک لق و دق صحرا میں ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ اسے میری ضرورت تھی اور مجھے اس کی۔ تاکہ ہمارا سفر اچھی طرح کٹ سکے میرا اور اس کا صرف یہ رشتہ تھا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ہم ہر شب مقررہ وقت پر ٹہلنے کو نکلتے۔ شبیر چوبی مکان کے پاس پہنچ کر شعر گاتا' پھر اکرام صاحب کے بنگلے سے کچھ دور کھڑے ہو کر نعرہ بلند کرتا' وزیر لال ٹین روشن کرتی اور اس کی روشنی کو ہوا میں لہرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ جاتی۔ شبیر اور اکرام صاحب باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتے اور میں لال ٹین کی

روشنی میں اس روشنی کے ذرے ڈھونڈتا رہتا جس سے میری زندگی منور ہو سکتی تھی۔
وزیر جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی نہ جانے کیا سوچتی رہتی؟

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2008

لائسنس

ابو کوچوان بڑا چھیل چھبیلا تھا۔ اس کا تانگہ گھوڑا بھی شہر میں نمبر ون تھا۔ کبھی معمولی سواری نہیں بٹھاتا تھا۔ اس کے لگے بندھے گاہک تھے جن سے اس کو روزانہ دس پندرہ روپے وصول ہو جاتے تھے جو ابو کے لیے کافی تھے۔ دوسرے کوچوانوں کی طرح نشہ پانی کی اسے عادت نہیں تھی۔ لیکن صاف ستھرے کپڑے پہننے اور ہر وقت بانکا بنے رہنے کا اسے بے حد شوق تھا۔

جب اس کا تانگہ کسی سڑک پر سے گھنگھرو بجاتا گزرتا تو لوگوں کی آنکھیں خود بخود اس کی طرف اٹھ جاتیں..... ''وہ بانکا ابو جا رہا ہے..... دیکھو تو کس ٹھاٹ سے بیٹھا ہے۔ ذرا پگڑی تو دیکھو کسی ترچی بندھی ہے''۔

ابو لوگوں کی نگاہوں سے یہ باتیں سنتا تو اس کی گردن میں ایک بڑا بانکا خم پیدا ہو جاتا اور اس کے گھوڑے کی چال اور زیادہ پرکشش ہو جاتی۔ ابو کے ہاتھوں نے گھوڑے کی باگیں کچھ اس انداز سے پکڑی ہوتی تھیں جیسے ان کو اسے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ گھوڑا اشاروں کے بغیر چلا جا رہا ہے۔ اس کو اپنے مالک کے حکم کی ضرورت نہیں۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابو اور اس کا گھوڑا چنی دونوں ایک ہیں۔ بلکہ سارا تانگہ ایک ہستی ہے اور وہ ہستی ابو کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔

وہ سواریاں جن کو ابو قبول نہیں کرتا تھا دل ہی دل میں اس کو گالیاں دیتی تھیں۔ بعض بد دعا بھی دیتی تھیں۔ ''خدا کرے اس کا گھمنڈ ٹوٹے..... اس کا تانگہ گھوڑا

کسی دریا میں جا گرے''۔

ابو کے ہونٹوں پر جو ہلکی ہلکی مونچھوں کی چھاؤں میں رہتے تھے خود اعتمادی مسکراہٹ ناچتی رہتی تھی۔ اس کو دیکھ کر کئی کوچوان جل بھن جاتے تھے۔ ابو کی دیکھا دیکھی چند کوچوانوں نے ادھر ادھر سے قرض لے کر تانگے بنوائے۔ ان کو پیتل کے ساز و سامان سے سجایا مگر پھر بھی ابو کی سی شان پیدا نہ ہو سکی۔ ان کو وہ گاہک نصیب نہ ہو سکے جو ابو اور اس کے تانگے گھوڑے کے شیدا تھے۔

ایک دن دوپہر کو ابو درخت کی چھاؤں میں تانگے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ ایک آواز اس کے کانوں میں بھنبھنائی۔ ابو نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک عورت تانگے کے بمپ کے پاس کھڑی تھی۔ ابو نے اسے بمشکل ایک نظر دیکھا مگر اس کی تیکھی جوانی ایک دم اس کے دل میں کھب گئی۔ وہ عورت نہیں جوان لڑکی تھی۔ سولہ سترہ برس کی۔ دبلی پتلی لیکن مضبوط رنگ سانولا مگر چمکیلا۔ کانوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں سیدھی مانگ ستواں ناک اس کی پھننگ پر ایک چھوٹا سا چمکیلا تل..... لمبا کرتا اور نیلا لاچا سر پر چدریا۔

لڑکی نے کنواری آواز میں ابو سے پوچھا ''ویرا ٹیشن کا کیا لو گے؟''

ابو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ شرارت اختیار کر گئی ''کچھ نہیں''۔

لڑکی کے چہرے کی سنولاہٹ سرخی مائل ہو گئی ''کیا لو گے ٹیشن کا''۔

ابو نے اس کو اپنی نظروں میں سموتے ہوئے کہا ''تجھ سے کیا لینا ہے بھاگ بھریے..... چل آ بیٹھ تانگے میں''۔

لڑکی نے گھبرائے ہوئے ہاتھوں سے اپنے مضبوط سینے کو ڈھانکا حالانکہ وہ

ڈھکا ہوا تھا ''کیسی باتیں کرتے ہو تم''۔

ابو مسکرایا ''چل آ..... اب بیٹھ بھی جا..... لے لیں گے جو تو دے دے گی''۔

لڑکی نے کچھ دیر سوچا پھر پائیدان پر پاؤں رکھ کر تانگے میں بیٹھ گئی ''جلدی لے چل ٹیشن''۔

ابو نے پیچھے مڑ کر دیکھا ''بڑی جلدی ہے تجھے سونیے''۔

''ہائے ہائے تو تو.....'' لڑکی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

تانگہ چل پڑا..... اور چلتا رہا..... کئی سڑکیں گھوڑے کے سموں کے نیچے سے نکل گئیں۔ لڑکی سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ ابو کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ جب بہت دیر ہو گئی تو لڑکی نے ڈرتی ہوئی آواز میں پوچھا ''ٹیشن نہیں آیا ابھی تک''۔

ابو نے معنی خیز انداز میں جواب دیا ''آ جائے گا..... تیرا میرا ٹیشن ایک ہی ہے''۔

''کیا مطلب؟''

ابو نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا ''الہڑے..... کیا تو اتنا بھی نہیں سمجھتی۔ تیرا میرا ٹیشن ایک ہی ہے۔ اسی وقت ایک ہو گیا تھا جب ابو نے تیری طرف دیکھا تھا..... تیری جان کی قسم تیرا غلام جھوٹ نہیں بولتا''۔

لڑکی نے سر پر پلو ٹھیک کیا۔ اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں وہ ابو کا مطلب سمجھ چکی ہے۔ اس کے چہرے سے اس بات کا بھی پتہ چلتا تھا کہ اس نے ابو کی بات کا برا نہیں مانا لیکن وہ اس کشمکش میں تھی کہ دونوں کا ٹیشن ایک ہو یا نہ ہو۔ ابو

بانکا سجیلا تو ہے لیکن کیا وفادار بھی ہے۔ کیا وہ اپنا ٹیشن چھوڑ دے جہاں اس کی گاڑی پتا نہیں کب کی جا چکی ہے۔

ابو کی آواز نے اسے چونکا دیا ''کیا سوچ رہی ہے بھاگ بھریے؟''

گھوڑا مست خرامی سے دلکی چل رہا تھا۔ ہوا خنک تھی۔ سڑک کے دورویہ اگے ہوئے درخت بھاگ رہے تھے۔ ان کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ گھنگھروؤں کی یک آہنگ جھنجناہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ ابو گردن موڑے لڑکی کے سانولے حسن کو دل ہی دل میں چوم رہا تھا..... کچھ دیر کے بعد اس نے گھوڑے کی باگیں جنگلے کی سلاخ کے ساتھ باندھ دیں اور اچک کر پچھلی سیٹ پر لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ خاموش رہی۔ ابو نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے ''دے دے اپنی باگیں میرے ہاتھ میں''۔

لڑکی نے صرف اتنا کہا ''چھوڑ بھی دے'' لیکن وہ فوراً ہی ابو کے بازوؤں میں تھی۔ اس کے بعد اس نے مزاحمت نہ کی۔ اس کا دل البتہ زور زور سے پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے خود کو چھڑا کر اڑ جانا چاہتا ہو۔

ابو ہولے ہولے پیار بھرے لہجے میں اس سے کہنے لگا ''یہ تانگہ گھوڑا مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا لیکن قسم گیارہویں والے پیر کی یہ بیچ دوں گا اور تیرے لیے سونے کے کڑے بنواؤں گا..... آپ پھٹے پرانے کپڑے پہنوں گا لیکن تجھے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ قسم وحدہ لاشریک کی زندگی میں یہ میرا پہلا پیار ہے..... تم میری نہ بنیں تو میں تیرے سامنے اپنا گلا کاٹ لوں گا''۔ پھر اس نے لڑکی کو اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ ''جانے کیا ہو گیا ہے مجھے..... چلو تمہیں ٹیشن چھوڑ آؤں''۔

لڑکی نے ہولے سے کہا ''نہیں..... اب تم مجھے ہاتھ لگا چکے ہو''۔

ابو کی گردن جھک گئی ''مجھے معاف کر دو مجھ سے غلطی ہو گئی''۔

''نبھا لو گے اس غلطی کو؟''

لڑکی کے لہجے میں چیلنج تھا۔ جیسے کسی نے ابو سے کہا ہو ''لے جاؤ گے اپنا تانگہ اس کے تانگے سے آگے نکال کے'' اس کا جھکا ہوا سر اٹھا۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ ..... ''بھاگ بھریے.....'' یہ کہہ کر اس نے اپنے مضبوط سینے پر ہاتھ رکھا ''ابو اپنی جان دے دے گا''۔

لڑکی نے اپنا ہاتھ بڑھایا ''تو یہ ہے میرا ہاتھ''۔

ابو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''قسم اپنی جوانی کی ابو تیرا غلام ہے''۔

دوسرے روز ابو اور اس لڑکی کا نکاح ہو گیا وہ ضلع گجرات کی موچن تھی نام اس کا عنایت یعنی نیتی تھا۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ آئی تھی وہ اسٹیشن پر اسکا انتظار کر رہے تھے کہ ابو اور اس کی مڈبھیڑ ہو گئی جو فوراً ہی محبت کی ساری منزلیں طے کر گئی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ ابو نے تانگہ گھوڑا بیچ کر تو نیتی کے لیے سونے کے کڑے نہیں بنوائے تھے لیکن اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں سے اس کو سونے کی بالیاں خرید دی تھیں۔ کئی ریشمی کپڑے بھی بنوا دیے تھے۔

لس لس کرتے ہوئے ریشمی لاچے میں جب نیتی ابو کے سامنے آتے تو اس کا دل ناچنے لگتا ''قسم پنج تن پاک کی دنیا میں تجھ جیسا سندر اور کوئی نہیں''۔ اور یہ کہہ کر وہ اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیتا ''تو میرے دل کی رانی ہے''۔

دونوں جوانی کی مستیوں میں غرق تھے۔ گاتے تھے ہنستے تھے سیریں کرتے

تھے ایک دوسرے کی بلائیں لیتے تھے۔ ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا کہ دفعتاً ایک روز پولیس نے ابو کو گرفتار کر لیا نیتی بھی پکڑی گئی۔ ابو پر اغوا کا مقدمہ چلا۔ نیتی ثابت قدم رہی لیکن پھر بھی ابو کو دس برس کی سزا ہو گئی۔ جب عدالت نے حکم سنایا تو نیتی ابو کے ساتھ لپٹ گئی۔ روتے روتے اس نے صرف اتنا کہا ''میں اپنے ماں باپ کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی..... گھر بیٹھ کر تیرا انتظار کروں گی''۔

ابو نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی ''جیتی رہ..... تانگہ گھوڑا میں نے دینے کے سپرد کیا ہوا ہے..... اس سے کرایہ وصول کرتی رہنا''۔

نیتی کے ماں باپ نے بہت زور لگایا مگر وہ ان کے ساتھ نہ گئی۔ تھک ہار کر انہوں نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ نیتی اکیلی رہنے لگی۔ دینا اسے شام کو پانچ روپے دے جاتا تھا جو اس کے خرچ کے لیے کافی تھے۔ اس کے علاوہ مقدمے کے دوران میں روزانہ پانچ روپے کے حساب سے جو کچھ جمع ہوا تھا وہ بھی اس کے پاس تھا۔

ہفتے میں ایک بار نیتی اور ابو کی ملاقات جیل میں ہوتی تھی جو کہ ان دونوں کے لیے بہت ہی مختصر تھی۔ نیتی کے پاس جتنی جمع پونجی تھی وہ ابو کو آسائشیں پہنچانے میں صرف ہو گئی۔ ایک ملاقات میں ابو نے نیتی کے بچے کانوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''بالیاں کہاں گئیں نیتی''؟

نیتی مسکرا دی اور سنتری کی طرف دیکھ کر ابو سے کہا ''گم ہو گئیں کہیں''۔

ابو نے قدرے غصے ہو کر کہا ''تم میرا اتنا خیال نہ رکھا کرو..... جیسا بھی ہوں

ٹھیک ہوں"۔

نیتی نے کچھ نہ کہا۔ وقت پورا ہو چکا تھا۔ مسکراتی ہوئی وہاں سے چل دی مگر گھر جا کر بہت روئی۔ گھنٹوں آنسو بہائے کیونکہ ابو کی صحت بہت گر رہی تھی اس ملاقات میں تو وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی۔ گرانڈیل ابو اب گھل گھل کر آدھا ہو گیا تھا۔ نیتی سوچتی کہ اس کو اس کا غم کھا رہا ہے۔ اس کی جدائی نے ابو کی یہ حالت کر دی ہے لیکن اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ دق کا مریض ہے اور یہ مرض اسے ورثے میں ملا ہے۔ ابو کا باپ ابو سے کہیں زیادہ گرانڈیل تھا۔ لیکن دق نے چند ہی دنوں میں اسے قبر کے اندر پہنچا دیا۔ ابو کا بڑا بھائی کڑیل جوان تھا مگر عین جوانی میں اس مرض نے اسے دبوچ لیا تھا۔ خود ابو اس حقیقت سے غافل تھا چنانچہ جیل کے ہسپتال میں جب کہ وہ آخری سانس لے رہا تھا اس نے افسوس بھرے لہجے میں نیتی سے کہا "مجھے معلوم ہوتا کہ میں اتنی جلدی مر جاؤں گا تو قسم وحدہ لاشریک کی تجھے کبھی اپنی بیوی نہ بناتا..... میں نے تیرے ساتھ بہت ظلم کیا..... مجھے معاف کر دے..... اور دیکھ میری ایک نشانی ہے میرا تانگہ گھوڑا..... اس کا خیال رکھنا..... اور چنی بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنا ابو نے تجھے پیار بھیجا ہے"۔

ابو مر گیا..... نیتی کا سب کچھ مر گیا۔ مگر وہ حوصلے والی عورت تھی۔ اس صدمے کو اس نے برداشت کر ہی لیا۔ گھر میں تن تنہا پڑی رہتی تھی۔ شام کو دینا آتا تھا اور اسے دم دلاسا دیتا تھا اور کہتا تھا "کچھ فکر نہ کرو بھابھی! اللہ میاں کے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی..... ابو میرا بھائی تھا..... مجھ سے جو ہو سکتا ہے خدا کے حکم سے کروں گا"۔

شروع شروع میں تو نیتی نہ سمجھی پر جب اس کے عدت کے دن پورے ہوئے تو دینے نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ یہ سن کر نیتی کے جی میں آئی کہ وہ اس کو دھکا دے کر باہر نکال دے مگر اس نے صرف اتنا کہا ''بھائی مجھے شادی نہیں کرنی''۔

اس دن سے دینے کے رویے میں فرق آ گیا۔ پہلے شام کو بلا ناغہ پانچ روپے ادا کرتا تھا۔ اب کبھی چار دینے لگا کبھی تین بہانہ یہ کہ بہت مندا ہے۔ پھر دو دو تین تین دن غائب رہنے لگا۔ بہانہ تھا کہ بیمار تھا یا تانگے کا کوئی کل پرزہ خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے جو نہ سکا۔ جب پانی سر سے نکل گیا تو نیتی نے دینے سے کہا ''بھائی دینے اب تم تکلیف نہ کرو۔ تانگہ گھوڑا میرے حوالے کر دو''۔

بڑی لیت و لعل کے بعد بالآخر دینے نے بادل ناخواستہ تانگہ گھوڑا نیتی کی تحویل میں دے دیا۔ اس نے ماجھے کے سپرد کر دیا جو ابو کا دوست تھا اسنے بھی کچھ دنوں کے بعد شادی کی درخواست کی۔ نیتی نے انکار کر دیا تو اس کی آنکھیں بدل گئیں۔ ہمدردی وغیرہ سب ہوا ہو گئی۔ نیتی نے اس سے تانگہ گھوڑا واپس لے لیا اور ایک انجانے کوچوان کے حوالے کر دیا۔ اسنے تو حد ہی کر دی ایک شام پیسے دینے آیا تو شراب میں دھت تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی نیتی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ نیتی نے اس کو خوب سنائیں اور کام سے ہٹا دیا۔

آٹھ دس روز تانگہ گھوڑا بیکار طویلے میں پڑا رہا۔ گھاس دانے کا خرچ علیحدہ طویلے کا کرایہ علیحدہ۔ نیتی عجیب الجھن میں گرفتار تھی۔ کوئی شادی کی درخواست کرتا تھا۔ کوئی اس کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا کوئی پیسے مار لیتا تھا۔

باہر نکلتی تھی تو لوگ بری نگاہوں سے گھورتے تھے۔ ایک رات اس کا ہمسایہ دیوار پھاند کے آ گیا اور دراز دستی کرنے لگا۔ نیتی سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی کہ کیا کرے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا ''کیوں نہ تانگہ میں آپ ہی جوتوں۔ آپ ہی چلاؤں''۔ ابو کے ساتھ جب وہ سیر کو جایا کرتی تھی تو تانگہ خود ہی چلاتی تھی۔ شہر کے راستوں سے بھی واقف تھی لیکن پھر اس نے سوچا ''لوگ کیا کہیں گے؟.....'' اس کے جواب میں اس کے دماغ نے کئی دلیلیں دیں۔ ''کیا حرج ہے..... کیا عورتیں محنت مزدوری نہیں کرتیں..... یہ کوئلے والیاں..... یہ دفتروں میں جانے والی عورتیں..... گھر میں بیٹھ کر کام کرنے والیاں تو ہزاروں ہوں گی..... پیٹ کسی حیلے سے پالنا ہی ہے''۔

نیتی نے کچھ دن سوچ بچار کیا۔ آخر میں فیصلہ کر لیا کہ وہ تانگہ خود ہی چلائے گی اس کو خود پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ اللہ کا نام لے کر وہ طویلے پہنچ گئی..... تانگہ جوتنے لگی تو سارے کوچوان ہکا بکا رہ گئے۔ بعض مذاق سمجھ کر ہنسے۔ جو بزرگ تھے انہوں نے نیتی کو سمجھایا کہ ایسا نہ کرو۔ یہ مناسب نہیں مگر نیتی نہ مانی۔ تانگہ ٹھیک ٹھاک کیا۔ پیتل کا سارا سامان اچھی طرح چمکایا۔ گھوڑے کو خوب پیار کیا اور ابو سے دل ہی دل میں پیار کی باتیں کرتی طویلے سے باہر نکل گئی۔ کوچوان حیرت زدہ تھے کیونکہ نیتی کے ہاتھ رواں تھے جیسے وہ تانگہ چلانے کے فن پر حاوی ہے۔

شہر میں ایک تہلکہ برپا ہو گیا کہ ایک خوبصورت عورت تانگہ چلا رہی ہے۔ ہر جگہ اسی بات کا چرچا تھا لوگ سنتے تھے تو اس وقت کا انتظار کرتے تھے جب وہ ان

کی سڑک پر سے گزرے گا۔

شروع شروع میں تو مرد سواریاں جھجکتی تھیں مگر یہ جھجک تھوڑی دیر میں دور ہو گئی اور خوب آمدن ہونے لگی۔ ایک منٹ کے لیے بھی نیتی کا تانگہ بیکار نہ رہتا تھا۔ ادھر سواری اتری ادھر بیٹھی۔ آپس میں سواریوں کی کبھی کبھی لڑائی ہو جاتی تھی۔ اس بات پر کہ نیتی کو پہلے کس نے بلایا تھا۔

جب کام زیادہ ہو گیا تو نیتی نے تانگہ جوتنے کے اوقات مقرر کر دیے صبح سات بجے سے بارہ بجے تک۔ دوپہر دو بجے سے چھ بجے تک..... یہ سلسلہ بڑا آرام دہ ثابت ہوا۔ چنی بھی خوش تھا مگر نیتی محسوس کر رہی تھی کہ اکثر لوگ صرف اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے اس کے تانگے بیٹھے بے مطلب بے مقصد اسے ادھر ادھر پھراتے تھے۔ آپس میں گندے گندے مذاق بھی کرتے تھے۔ صرف اس کے سنانے کے لیے آپس میں باتیں کرتے تھے۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ خود کو نہیں بیچتی لیکن لوگ چپکے چپکے اسے خرید رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ شہر کے سارے کوچوان اس کو برا سمجھتے ہیں۔ ان تمام احساسات کے باوجود مضطرب نہیں تھی۔ اپنی خود اعتمادی کے باعث وہ پرسکون تھی۔

ایک دن کمیٹی والوں نے نیتی کو بلایا اور اس کا لائسنس ضبط کر لیا۔ وجہ یہ بتائی کہ عورت تانگہ نہیں چلا سکتی۔ نیتی نے پوچھا ''جناب عورت تانگہ کیوں نہیں چلا سکتی؟''

جواب ملا ''بس..... نہیں چلا سکتی۔ تمہارا لائسنس ضبط ہے''۔

نیتی نے کہا ''حضور! آپ گھوڑا تانگہ بھی ضبط کرلیں مجھے یہ تو بتائیں کہ عورت تانگہ کیوں نہیں جوت سکتی عورتیں چرخہ چلا کر اپنا پیٹ پال سکتی ہیں۔ عورتیں ٹوکری ڈھو کر روزی کما سکتی ہیں عورتیں لینوں پر کوئلے چن چن کر اپنی روٹی پیدا کر سکتی ہیں ..... میں تانگہ کیوں نہیں چلا سکتی ..... مجھے اور کچھ آتا ہی نہیں ..... تانگہ گھوڑا میرے خاوند کا ہے ..... میں اسے کیوں نہیں چلا سکتی۔ میں اپنا گزارہ کیسے کروں گی؟ ..... حضور آپ رحم کریں ..... محنت مزدوری سے کیوں روکتے ہیں مجھے؟ ..... میں کیا کروں بتایئے نا مجھے''۔

افسر نے جواب دیا ''جاؤ بازار میں جا کر بیٹھو وہاں زیادہ کمائی ہے''۔

یہ سن کر نیتی کے اندر جو اصل نیتی تھی جل کر راکھ ہو گئی ..... ہولے سے ''اچھا جی'' کہہ کر وہ چلی گئی۔ اونے پونے داموں تانگہ گھوڑا بیچا اور سیدھی ابو کی قبر پر گئی۔ ایک لحظے کے لیے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ جیسے بارش کے بعد چلچلاتی دھوپ نے زمین کی ساری نمی چوس لی تھی۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ وا ہوئے اور وہ قبر سے مخاطب ہوئی ''ابو ..... تیری نیتی آج کمیٹی کے دفتر میں مر گئی''۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ دوسرے دن عرضی دی ..... اس کو اپنا جسم بیچنے کا لائسنس مل گیا۔

☆☆☆

ماتمی جلسہ

رات رات میں یہ خبر شہر کے اس کونے سے اس کونے تک پھیل گئی کہ اتاتورک کمال مر گیا ہے۔ ریڈیو کی تھرتھراتی ہوئی زبان سے یہ سنسنی پھیلانے والی خبر ایرانی ہوٹلوں میں سٹے بازوں نے سنی جو چائے کی پیالیاں سامنے رکھے آنے والے نمبر کے بارے میں قیاس دوڑا رہے تھے اور وہ سب کچھ بھول کر کمال اتاترک کی بڑائی میں گم ہو گئے۔

ہوٹل میں سفید پتھر والے میز کے پاس بیٹھے ہوئے ایک سٹوری نے اپنے ساتھی سے یہ خبر سن کر لرزاں آواز میں کہا "مصطفیٰ کمال مر گیا ہے"۔

اسکے ساتھی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی "کیا کہا مصطفیٰ کمال مر گیا ہے"۔

اس کے بعد دونوں میں اتاترک کمال کے متعلق بات چیت شروع ہو گئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے اب ہندوستان کا کیا ہو گا؟ میں نے سنا تھا یہ مصطفیٰ کمال یہاں حملہ کرنے والا ہے..... ہم آزاد ہو جاتے مسلمان قوم آگے بڑھ جاتی..... افسوس تقدیر کے ساتھ کسی کی پیش نہیں چلتی!"

دوسرے نے جب یہ بات سنی تو اس کے روئیں بدن پر چیونٹیوں کے مانند سرکنے لگے۔ اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے دل میں جو پہلا خیال آیا یہ تھا "مجھے کل جمعہ سے نماز شروع کر دینی چاہیے....."

اس خیال کو بعد میں اس نے مصطفیٰ کمال پاشا کی شاندار مسلمانی اور اس کی

بڑائی میں تحلیل کر دیا۔

بازار کی ایک تنگ گلی میں دو تین کوکین فروش کھاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے ۔ایک نے پاس کی پیک بڑی صفائی سے بجلی کے کھمبے پر پھینکی اور کہا ''میں مانتا ہوں مصطفیٰ کمال بہت بڑا آدمی تھا لیکن محمد بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بمبئی میں تین چار ہوٹلوں کا نام اسی پر رکھا گیا ہے''۔

دوسرے نے جو اپنی ننگی پنڈلیوں پر سے ایک کھردرے چاقو سے میل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا ''محمد علی کی موت پر تو بڑی شاندار ہڑتال ہوئی تھی.....''

ہاں بھئی تو کل ہڑتال ہو رہی ہے کیا؟'' تیسرے نے ایک کی پسلیوں میں کہنی سے ٹہوکا دیا۔ اس نے جواب دیا ''کیوں نہ ہو گی..... ارے اتنا بڑا مسلمان مر جائے اور ہڑتال نہ ہو''۔

یہ بات ایک راہ گزر نے سن لی اس نے دوسرے چوک میں اپنے ساتھیوں سے کی اور ایک گھنٹے میں ان سب لوگوں کو جو دن کو سونے اور رات کو بازاروں میں جاگتے رہنے کے عادی ہیں۔ معلوم ہو گیا کہ صبح ہڑتال ہو رہی ہے۔

ابو قصائی رات کے دو بجے اپنی کھولی میں آیا۔ اس نے آتے ہی طاق میں سے بہت سی چیزوں کو ادھر ادھر پلٹ کرنے کے بعد ایک پڑیا نکالی اور ایک دیگچی میں پانی بھر کر اس کو اس میں گھولنا شروع کر دیا۔

اس کی بیوی جو دن بھر کی تھکی ماندی ایک کونے میں ٹاٹ پر سو رہی تھی۔ برتن کی رگڑ سن کر جاگ پڑی۔ اس نے لیٹے لیٹے کہا ''آ گئے ہو؟''

''ہاں آ گیا ہوں'' یہ کہہ کر ابو نے قمیص اتار کر دیگچی میں ڈال دی اور اسے پانی کے اندر مسلنا شروع کر دیا۔

اس کی بیوی نے پوچھا ''پر یہ تم کر کیا رہے ہو؟'' ''مصطفیٰ کمال مر گیا ہے کل ہڑتال ہو رہی ہے''۔ اس کی بیوی یہ سن کر گھبراہٹ کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کیا مارا ماری ہو گی..... میں تو ان ہر روز کے فسادوں سے بڑی تنگ آ گئی ہوں''۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے تجھ سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ تو ہندوؤں کے اس محلے سے اپنا مکان بدل ڈال پر نہ جانے تو کب سنے گا''۔

ابو جواب میں ہنسنے لگا ''اری پگلی..... یہ ہندو مسلمانوں کا فساد نہیں ہے۔ مصطفیٰ کمال مر گیا ہے..... وہی جو بہت بڑا آدمی تھا..... کل اس کے سوگ میں ہڑتال ہو گی''۔

''جانے میری بلا یہ بڑا آدمی کون ہے..... پر تو یہ کر کیا رہا ہے؟'' بیوی نے پوچھا ''سوتا کیوں نہیں ہے''۔

''قمیص کو کالا رنگ دے رہا ہوں۔ صبح ہمیں ہڑتال کرانے جانا ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے قمیص کو نچوڑ کر دو کیلوں کے ساتھ لٹکا دی جو دیوار میں گڑی ہوئی تھیں۔

دوسرے روز صبح کو سیاہ پوش مسلمانوں کی ٹولیاں کالے جھنڈے لیے بازاروں میں چکر لگا رہی تھیں۔ یہ سیاہ پوش مسلمان دکانداروں کی دکانیں بند کرا رہے تھے اور یہ نعرے لگا رہے تھے ''انقلاب زندہ آباد انقلاب زندہ باد''۔

ایک ہندو نے جو اپنی دکان کھولنے کے لیے جا رہا تھا یہ نعرے سنے اور نعرے لگانے والوں کو دیکھا تو چپ چاپ ٹرام میں بیٹھ کر وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے

ہندو اور پارسی دکانداروں نے جب مسلمانوں کے ایک گروہ کو چیختے چلاتے اور نعرے مارتے دیکھا تو انہوں نے جھٹ پٹ اپنی دکانیں بند کر دیں۔

دس پندرہ سیاہ پوش پگیں ہانکتے ایک بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا ''دوست ہڑتال ہوئی تو خوب ہے پر ویسی نہیں ہوئی جیسی محمد علی کے ٹیم پر ہوئی تھی..... ٹرامیں تو اسی طرح چل رہی ہیں''۔

اس ٹولی میں جو سب سے زیادہ جوشیلا تھا اور جس کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا تنک کر بولا۔ ''آج بھی نہیں چلیں گی''۔ یہ کہہ کر وہ ٹرام کی طرف بڑھا جو لکڑی کے ایک شیڈ کے نیچے مسافروں کو اتار رہی تھی۔ ٹولی کے باقی آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا اور ایک لمحہ کے اندر سب کے سب ٹرام کی سرخ گاڑی کے اردگرد تھے۔ سب مسافر زبردستی اتار دیے گئے۔

شام کو ایک وسیع میدان میں ماتمی جلسہ ہوا۔ شہر کے سب ہنگامہ پسند جمع تھے۔ خوانچہ فروش اور پان بیڑی والے چل پھر کر اپنا سودا بیچ رہے تھے۔ جلسہ گاہ کے باہر عارضی دکانوں کے پاس ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ چاٹ کے چنوں اور ابلے ہوئے آلوؤں کی خوب بکری ہو رہی تھی۔

جلسہ گاہ کے اندر اور باہر بہت بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس ہجوم میں کئی آدمی ایسے بھی چل رہے تھے جو یہ معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ اتنے آدمی کیوں جمع ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب گلے میں دوربین لٹکائے ادھر ادھر چکر کاٹ رہے تھے۔ دور سے اتنی بھیڑ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ پہلوانوں کا دنگل ہو رہا ہے۔ وہ ابھی ابھی اپنے گھر سے نئی دوربین لے کر دوڑے دوڑے آ رہے

تھے اور اس کا امتحان لینے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ میدان کے آہنی جنگلے کے پاس دو آدمی کھڑے تھے آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا ''بھئی یہ مصطفیٰ کمال تو واقعی کوئی بہت بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے..... میں جو صابن بنانے والا ہوں اس کا نام کمال سوپ رکھوں گا..... کیوں کیسا رہے گا؟''

دوسرے نے جواب دیا ''وہ بھی برا نہیں تھا جو تم نے پہلے سوچا تھا جناح سوپ ..... یہ جناح مسلم لیگ کا بہت بڑا لیڈر ہے''۔

''نہیں نہیں کمال سوپ اچھا رہے گا بھائی مصطفیٰ کمال اس سے بڑا آدمی ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''آؤ چلیں جلسہ شروع ہونے والا ہے''۔ وہ دونوں جلسہ گاہ کی طرف چل دیے۔

جلسہ شروع ہوا۔

آغاز میں نظمیں گائی گئیں جن میں مصطفیٰ کمال کی بڑائی کا ذکر تھا۔ پھر ایک صاحب تقریر کرنے کے لیے اٹھے۔ آپ نے کمال اتاترک کی عظمت بڑے بلند بانگ لفظوں میں بیان کرنا شروع کی۔ حاضرین جلسہ اس تقریر کو خاموشی سے سنتے رہے۔ جب کبھی مقرر کے یہ الفاظ گونجتے ''مصطفیٰ کمال نے درہ دانیال سے انگریزوں کو لات مار کے باہر نکال دیا''۔ یا ''کمال نے یونانی بھیڑوں کو اسلامی خنجر سے ذبح کر ڈالا'' تو ''اسلام زندہ باد'' کے نعروں سے میدان کانپ کانپ اٹھتا۔

یہ نعرے مقرر کی قوت گویائی اور تیز کر دیتے اور وہ زیادہ جوش سے اتاترک کمال کی عظیم الشان شخصیت پر روشنی ڈالنا شروع کر دیتا۔

مقرر کا ایک ایک لفظ حاضرین جلسہ کے دلوں میں ایک جوش وخروش پیدا کر رہا تھا۔

''جب تک تاریخ میں گیلی پولی کا واقع موجود ہے۔ برطانیہ کی گردن ترکی کے سامنے خم رہے گی۔ صرف ترکی ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے برطانوی حکومت کا کامیاب مقابلہ کیا اور صرف مصطفیٰ کمال ہی ایسا مسلمان ہے جس نے غازی صلاح الدین ایوبی کی سپاہیانہ عظمت کی یاد تازہ کی۔ اس نے بہ نوک شمشیر یورپی ممالک سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ ٹرکی کو یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا۔ مگر کمال نے اسے صحت اور قوت بخش کر مرد آہن بنا دیا''۔

جب یہ الفاظ جلسہ گاہ میں بلند ہوئے تو انقلاب زندہ باد انقلاب زندہ باد کے نعرے پانچ منٹ تک متواتر بلند ہوتے رہے۔

اس سے مقرر کا جوش بہت بڑھ گیا۔ اس نے اپنی آواز کو اور بلند کر کے کہنا شروع کیا ''کمال کی عظمت مختصر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنے ملک کے لیے وہ وہ خدمات انجام دی ہیں جس کو بیان کرنے کے لیے کافی وقت چاہیے۔ اس نے ٹرکی میں جہالت کا دیوالہ نکال دیا۔ تعلیم عام کر دی۔ نئی روشنی کی شعاعوں کو پھیلایا۔ یہ سب کچھ اس نے تلوار کے زور سے کیا۔ اس نے دین کو جب علم سے علیحدہ کیا تو بہت سے قدامت پسندوں نے اس کی مخالفت کی مگر وہ سر بازار پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ اس نے جب یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی ترک رومی ٹوپی نہ پہنے تو بہت سے جاہل لوگوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا چاہی مگر یہ آواز ان کے گلے ہی میں دبا دی گئی۔ اس نے جب یہ حکم دیا کہ اذان ترکی زبان

میں ہوتو بہت سے ملاؤں نے حکم عدولی کی مگر وہ قتل کر دیے گئے''۔

''یہ کفر بکتا ہے'' جلسہ گاہ میں ایک شخص کی آواز بلند ہوئی اور فوراً ہی سب لوگ مضطرب ہو گئے۔

''یہ کافر جھوٹ بولتا ہے''۔ کے نعروں میں مقرر کی آواز گم ہو گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا اور وہ چکرا کر اسٹیج پر گر پڑا..... جلسے میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔

اسٹیج پر مقرر کا ایک دوست اس کے ماتھے پر سے خون پونچھ رہا تھا اور جلسہ گاہ ان نعروں سے گونج رہی تھی ''مصطفیٰ کمال زندہ باد' مصطفیٰ کمال زندہ باد''۔

☆☆☆

مجید کا ماضی

مجید کی ماہانہ آمدن ڈھائی ہزار روپے تھی۔ موٹر تھی ایک عالیشان کوٹھی تھی۔ بیوی تھی۔ اس کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے میل جول تھا۔ مگر جب کبھی وہ وسکی کے تین چار پیگ پی لیتا تو اسے اپنا ماضی یاد آ جاتا۔ وہ سوچتا کہ اب وہ اتنا خوش نہیں جتنا کہ پندرہ برس پہلے تھا۔ جب اس کے پاس رہنے کو کوٹھی تھی نہ سواری کے لیے موٹر۔ بیوی تھی نہ کسی عورت سے اس کی شناسائی تھی۔ ڈھائی ہزار روپے تو ایک اچھی خاصی رقم ہے۔ ان دنوں اس کی آمدن صرف ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ ساٹھ روپے جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ اس کی زندگی افتان وخیزان حالات کے ہوتے ہوئے بھی ہموار تھی۔

اب اسے بے شمار تفکرات سامنے تھے۔ کوٹھی کے بیوی کے بچوں کے ان عورتوں کے جن سے اس کا میل جول تھا۔ انکم ٹیکس کا مسئلہ الگ تھا۔ سیلز ٹیکس کا جھگڑا جدا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی الجھنیں تھیں جن سے مجید کو کبھی نجات ہی نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ اب وہ اس زمانے کو اکثر یاد کیا کرتا تھا جب اس کی زندگی ایسے تفکرات اور ایسی الجھنوں سے آزاد تھی۔ وہ ایک بڑی غریبی کی لیکن بڑی خوشگوار زندگی بسر کرتا تھا۔

انکم ٹیکس زیادہ لگ گیا ہے۔ ماہروں سے مشورہ کرو۔ آفیسروں سے ملو۔ ان کو رشوت دو۔ سیلز ٹیکس کا جھگڑا چکاؤ۔ بلیک مارکیٹ کرو۔ یہاں سے جو کماؤ اس کو وائٹ کرو۔ جھوٹی رسیدیں بناؤ۔ مقدموں کی تاریخیں بھگتو۔ بیوی کی فرمائشیں

پوری کرو۔ بچوں کی نگہداشت کرو۔ یوں تو مجید کا کام بڑی مستعدی سے کرتا تھا اور وہ اپنی اس نئی ہنگامہ خیز زندگی میں رچ مچ گیا تھا لیکن اس کے باوجود ناخوش تھا۔ یہ ناخوشی اسے کاروباری اوقات میں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کا احساس اس کو صرف اس وقت ہوتا تھا جب وہ فرصت کے اوقات میں آرام سے بیٹھ کر وسکی کے تین چار پیگ پیتا تھا۔ اس وقت بیتا ہوا زمانہ اس کے دل و دماغ میں ایک دم انگڑائیاں لیتا ہوا بیدار ہو جاتا اور وہ بڑا سکون محسوس کرتا لیکن جب اس بیتے ہوئے زمانے کی تصویر اس کے دل و دماغ میں محو ہو جاتی تو وہ بہت مضطرب ہو جاتا ۔ پر یہ اضطراب دیرپا نہیں ہوتا تھا کیونکہ فوراً ہی اپنی کاروباری الجھنوں میں گرفتار ہو جاتا تھا۔

مجید نے جو کچھ کمایا تھا اپنی محنت و مشقت سے بنایا تھا۔ کوٹھی اس کا سازوسامان موٹر غرضیکہ ہر چیز اسکے گاڑھے پسینے کی کمائی تھی۔ اس کو اس بات کا بہت مان تھا کہ آسائش کے جتنے سامان ہیں سب اس نے خود بنائے ہیں۔ اس نے کسی سے مدد نہیں لی لیکن تفکرات اب زیادہ ہو گئے تھے۔

وہ جو دس پندرہ عورتیں تھیں اس کے لیے وبال جان بن گئی تھیں۔ ایک سے ملو تو دوسری ناراض ہو جاتی تھی۔ ٹیلی فوم پہ ٹلی فون آ رہے ہیں۔ بیوی کا ڈر الگ کاروبار کی فکر جدا عجب جھنجٹ تھا۔ مگر وہ دن بھی تھے جب مجید کو صرف دو روپے روزانہ ملتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے مگر دن عجیب انداز میں گزرتے تھے۔ بڑے دلچسپ تھے وہ دن۔ بڑی دلچسپ تھیں وہ راتیں جو لکڑی کے ایک بنچ پر گزرتی تھیں جس میں ہزار ہا کھٹمل تھے خدا معلوم کتنے

عمر رسیدہ کیونکہ وہ بنچ بہت پرانی تھی۔ اس کے مالک نے دس برس پہلے اس کو ایک دکاندار سے لیا تھا جو اپنا کاروبار سمیٹ رہا تھا۔ اس دکاندار نے گیارہ برس پہلے اس کا سودا ایک کباڑی سے کیا تھا۔

مجید کو جو مزا جو لطف اس کھٹملوں سے بھری ہوئی بنچ پر سونے میں آتا تھا اب اسے اپنے پر تکلف سپرنگوں والے پلنگ پر سونے میں نہیں آتا تھا۔ اب اسے ہزاروں کی فکر ہوتی تھی۔ اس وقت صرف دو روپے روزانہ کی۔ ان دنوں اس کے پاس کینوس کے دو بوٹ تھے اب سینکڑوں تھے۔ مگر وہ بات نہیں تھی۔ ہر روز دن کے کام سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے دفتر کی بنچ پر سونے لگتا تو بوٹ اتار کر اس پر بلینکو ملتا۔ صبح اٹھ کر حمام میں اکنی دے کر نہاتا۔ شیو کرتا۔ سامنے ہوٹل میں باہر والے سے کہتا کہ اس کا ناشتہ لے آئے۔ ایک مکھن لگا براؤن ایک پیالی چائے لطف آجاتا۔ ناشتہ کر کے وہ پاسنگ شو کا سگریٹ پیتا۔ ایک پان کھاتا اور کام شروع کر دیتا۔

دوپہر کا کھانا وہ بھنڈی بازار میں حاجی کے ہوٹل میں کھاتا۔ یہ ہوٹل اتنا اچھا تھا۔ کھڑی دال گھی میں بگھاری ہوئی کتنی مزیدار ہوتی تھی۔ کھارا گوشت تو بے حد لذیذ ہوتا تھا۔ پھر برف کا ٹھنڈا پانی۔ پاسنگ شو کا ایک سگریٹ اس کا سارا وجود ہشاش بشاش ہو جاتا۔

کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام کیا۔ پھر کام شروع کیا۔ شام کو چھ بجے فارغ ہوئے۔ ایک آنہ ٹریم پر خرچا اور سیدھے اپالو بندر پہنچ گئے۔ ٹھنڈی ہوا۔ بھانت بھانت کے آدمی۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں۔ وسیع و

عریض سمندر اونچی اونچی لہریں ۔ کشتیاں موٹریں سائکلیں خوبصورت عورتیں، گجراتی عورتیں، مرہٹی عورتیں تیکھی تیکھی ناک والی ۔ اینگلو انڈین اور یورپین عورتیں ۔ یہ سب اس کے پاس سے گزرتیں ۔ وہ ان کو دیکھتا تو اس کے دل و دماغ کو فرحت پہنچتی ۔ اس کو کبھی یہ خواہش نہ ہوتی کہ ان سے کوئی اس کی ہو جائے گی لیکن اس بیوی کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے اس کا جنسی میل جول تھا۔ اب وہ ہر خوبصورت عورت کو شہوانی نظروں سے دیکھتا تھا تر کیبیں سوچتا تھا کہ کس طرح ان کو حاصل کیا جائے ۔

اب بھی وہ سیر کرتا تھا۔ باغوں میں گھومتا تھا مگر پھول اتنے خوبصورت دکھائی نہیں دیتے تھے جتنے کہ اس زمانے میں دکھائی دیتے تھے ۔ اب سینکڑوں پھول اس کے گلدانوں میں پڑے رہتے تھے جو مرجھا جانے پر پھینک دیے جاتے تھے۔ اس کی نگاہ ان پر پڑتی ہی نہیں تھی ۔ پڑتی بھی ہوگی تو وہ ان میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا تھا۔

ایک دن اپالو بندر گئے دوسرے دن چوپاٹی چلے گئے ۔ دہی بڑے اور چاٹ کھائی ۔ گیلی ریت پر بیٹھے سمندر کا نظارہ کرتے رہے ۔ دور حد نگاہ تک پھیلا سمندر دھوپ میں چاندنی کی طرح چمکتی ہوئی لہریں ۔ کشتیوں کے سفید سفید بادبان یا ہس سے جی اکتایا تو مالابار ہل چلے گئے ۔ ہینگنگ گارڈنز ۔ کیسا فرحت بخش مقام تھا۔

اس زمانے میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اس کو ساری دنیا دوست نظر آتی تھی ۔ ٹریم اس کی دوست تھی ۔ کھلا آسمان اس کا دوست تھا ۔ سڑکیں اور فٹ پاتھ اس

کے دوست تھے۔ کھٹملوں سے بھری ہوئی بنچ پر سونے سے پہلے وہ فٹ پاتھوں پر سویا کرتا تھا..... ہر چیز اس کو اپنی محسوس ہوتی تھی مگر اب اپنے بھی پرائے لگتے تھے سینکڑوں حریف تھے کاروبار میں عشق بازیوں میں ہر جگہ ہر مقام پر اس کا کوئی نہ کوئی حریف موجود ہوتا تھا۔

وہ زندگی عجیب وغریب تھی۔ یہ زندگی بھی عجیب وغریب تھی مگر دونوں میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ وہ تفکر سے آزاد تھی۔ یہ تفکر سے پر۔ چھوٹی سے چھوٹی خوشی اس کے دل ودماغ میں ایک عرصے تک موجود رہتی۔ ایک عرصے تک اس کو شاداں وفرحاں رکھتی۔ چھ آنے دے کر ایک میل ٹیکسی میں بیٹھے تو یہ ایک بہت بڑی عیاشی تھی۔ بھکاری کو ایک پیسہ دیا تو بڑی روحانی مسرت محسوس کی۔ اب وہ سینکڑوں کی خیرات کرتا تھا اور کوئی روحانی مسرت محسوس نہیں کرتا تھا اس لیے کہ یہ محض نمائش کی خاطر ہوتی تھی۔

اس زمانے میں اس کی عیاشیاں بڑی چھوٹی چھوٹی مگر بڑی دلچسپ ہوتی تھیں خود کو خوش کرنے کے لیے وہ بڑے نرالے طریقے ایجاد کر لیتا تھا۔

الیکٹرک ٹرین میں بیٹھے اور کسی گاؤں میں جا کر تاڑی پینے لگے۔

پتنگ لیا اور چوپائی پر بچوں کے ساتھ اڑانے لگے۔

دادر اسٹیشن پر صبح سویرے چلے گئے اور سکول جانے والی لڑکیاں تاڑتے رہے..... پل کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اینگلو انڈین لڑکیاں اسکرٹ پہنے اوپر چڑھتیں تو ان کی ننگی ٹانگیں نظر آتیں۔ اس نظارے سے اس کو بڑی طفلانہ مسرت محسوس ہوتی۔

کبھی کبھی طویل فاصلے پیدل طے کرنا۔ گھر پہنچتا تو اسے خوشی ہوتی کہ اس نے اکنی یا دونی بچالی ہے۔ یہ اکنی یا دونی کسی ایسی چیز پر خرچ کرتا جو اس کے روزانہ پروگرام میں نہیں ہوتی تھی۔

کسی لڑکی کو محبت بھرا خط لکھا اور جو پتا دماغ میں آیا لکھ کر پوسٹ کر دیا اور اس حماقت پر دل ہی دل میں خوب ہنسے۔

ایک انگلی کا ناخن بڑھالیا اور کسی دکان سے ٹسٹ کرنے کے بہانے اس پر کیوٹکس لگالیا۔

ایک دن صرف دوسروں سے مانگ مانگ کے سگریٹ پیے اور بے حد شرارت بھری خوشی محسوس کی۔

دفتر میں بنچ کے کھٹملوں نے زیادہ تنگ کیا تو ساری رات بازاروں میں گھومتے رہے اور بجائے کوفت کے راحت محسوس کی۔

جیب میں پیسے کم ہوئے تو دوپہر کا کھانا گول کر دیا اور یہ محسوس کیا کہ وہ کھا چکا ہے۔

اب یہ باتیں نہیں تھیں۔ دفتر سے اس نے روپے کمانے کے ڈھنگ سیکھے۔ دولت آنے لگی تو یہ سب باتیں آہستہ آہستہ غائب ہوگئیں۔ اس کی یہ ننھی ننھی مسرتیں سب سونے اور چاندی کے نیچے دب گئیں۔

اب رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں۔ مگر ان سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا تھا۔ جو پل کے نیچے کھڑے ہو کر ایک خاص زاویے سے ننگی محرک ٹانگیں دیکھنے سے محسوس ہوتا تھا۔ اس کی راتیں بالکل تنہا گزرتی تھیں۔ اب کوئی نہ کوئی عورت اس

کے آغوش میں ہوتی مگر وہ سکون غائب تھا۔ وہ کنوارا سکون جس میں وہ رات بھر ملفوف رہتا تھا۔ اب اسے یہ فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ کہیں اس کی بیوی کو پتہ نہ چل جائے کہیں یہ عورت حاملہ نہ ہو جائے۔ کہیں اس کو بیماری نہ لگ جائے۔ کہیں اس عورت کا خاوند نہ آن دھمکے۔ پہلے ایسے تفکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اب اس کے پاس ہر قسم کی شراب موجود رہتی تھی مگر وہ مزہ وہ سرور جو اسے پہلے ہر روز شام کو جاپان کی بنی ہوئی اب ہی بیئر پینے کا آتا تھا بالکل غائب ہی ہو گیا تھا

۔

اس کا معمول تھا کہ دفتر سے فارغ ہو کر چوپاٹی یا اپالو بندر کی سیر کرے۔ خوب گھومے پھرے۔ نظاروں کا مزہ لیا آٹھ بجے تو گھر کا رخ کیا۔ کسی نل سے منہ دھویا اور بائی کھلہ پل کے پاس والی بار میں داخل ہو گئے۔ پارسی سیٹھ کو جو بہت ہی موٹا اور اس کی ناک بڑی بے ہنگم تھی۔ صاحب جی کہا ''کم سیٹھ سوں حال چھے؟''

اس کو بس صرف اتنی گجراتی آتی تھی مگر جب وہ کہتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی کہ وہ اتنے الفاظ بول سکتا ہے۔ سیٹھ مسکراتا اور کہتا ''سارو چے سارو چھے''۔

پھر وہ پارسی سیٹھ کے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر جنگ کی باتیں چھیڑ دیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ یہاں سے ہٹ کر وہ کونے والی میز کے پاس بیٹھ جاتا۔ یہ اس کی محبوب میز تھی۔ اس کے اوپر کا حصہ سنگ مرمر کا تھا۔ بیرا اسے گیلے کپڑے سے صاف کرتا اور مجید سے کہتا ''بولو سیٹھ''۔

یہ سن کر مجید خود کو واقعی سیٹھ سمجھتا۔ اس وقت اس کی جیب میں ایک روپے چار

آنے ہوتے۔ وہ بیرے کی طرف دیکھ کر بڑی شان سے مسکراتا اور کہتا ''ہر روز تم مجھ سے پوچھتے ہو سب جانتے ہو..... لے آؤ جو پیا کرتا ہوں''۔

بیرا اپنی عادت کے مطابق جانے سے پہلے گیلے کپڑے سے میز صاف کرتا۔ پونچھ کر ایک گلاس رکھتا۔ ایک پلیٹ میں کابلی چنے دوسری میں کھاری سینگ یعنی نمک لگی مونگ پھلی لاتا۔ مجید اس سے کہتا ''پاپڑ لانا تم ہمیشہ بھول جاتے ہو''۔

یہ چیزیں گزک کے طور پر بیئر کے ساتھ مفت ملی تھیں۔ مجید نے یہ طریقہ ایجاد کیا تھا کہ بیرے سے کابلی چنوں کی ایک اور پلیٹ منگوا لیتا تھا۔ چنے کافی بڑے بڑے ہوتے تھے نمک اور کالی مرچ سے بہت مزیدار بن جاتے تھے۔ مونگ پھلی کی پلیٹ ہوتی تھی۔ یہ سب ملا کر مجید کا رات کا کھانا بن جاتا تھا۔

بیئر آتی تو وہ بڑے پرسکون انداز میں اس کو گلاس میں انڈیلتا۔ آہستہ آہستہ گھونٹ بھرتا۔ ٹھنڈی یخ بیئر اس کے حلق کے نیچے اترتی تو ایک بڑی عجیب فرحت اس کو محسوس ہوتی۔ اس کو ایسا لگتا کہ ساری دنیا کی ٹھنڈک اس کے دل و دماغ میں جمع ہو گئی ہے..... موٹے پارسی کی طرف دیکھتا اور سوچتا۔ یہ پارسیوں کی ناک کیوں اتنی موٹی ہوتی ہے۔ اس قوم نے کیا قصور کیا ہے کہ خدا ان کی ناکوں سے بالکل غافل ہے..... پرسوں ٹرین میں جو پارسن بیٹھی تھی بڑا سڈول بدن' خوبصورت آنکھیں ابھرا ہوا سینہ بے داغ سفید رنگ۔ ماتھا کشادہ پتلے پتلے ہونٹ لیکن یہ بری طوطے ایسی ناک اس کو دیکھ کر مجید کو بہت ترس آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ آیا ایسی کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ اس کی ناک ٹھیک ہو جائے..... پھر اس کے دماغ میں مختلف اوقات پر دیکھی ہوئی خوبصورت اور جوان لڑکیاں تیرنے لگتی

تھیں۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کا شباب بیئر میں گھول کر پی رہا ہے۔

دیر تک وہاں بیٹھا وہ اپنی زندگی کے حسین لمحات کو دہراتا رہتا۔

پندرہ دن ہوئے اپالو بندر پر جب تیز ہوا میں ایک یہودن لڑکی کا ریشمی سکرٹ اٹھا تھا تو کتنی متناسب اور حسین ٹانگوں کی جھلک دکھائی دی تھی۔

پچھلے اتوار ایرانی کے ہوٹل کے پائے کا شوربہ کتنا لذیذ تھا۔ کیسے چٹخارے لے لے کر اس نے اس میں گرم گرم نان بھگو کر کھایا تھا۔

رنگین فلم کتنا اچھا تھا۔ رقص کتنا دلفریب تھا ان عورتوں کا۔

آج صبح ناشتے کے بعد سگریٹ پی کر لطف آ گیا۔ ایسا لطف ہر روز آیا کرے تو مزے آ جائیں۔

وہ میاں بیوی جو اس نے دادر اسٹیشن پر دیکھے تھے آپ میں کتنے خوش تھے۔ کبوتر اور کبوتری کی طرح گنگ رہے تھے۔

کیکی مستری بڑا اچھا آدمی تھا۔ کل میں نے اس پر وہ مانگی تو اس نے مفت دے دی کہنے لگا ''اس کے دام کیا لوں گا آپ سے''۔ پچھلے ماہ اس نے وقت پر میری مدد بھی کی تھی پانچ روپے ادھار مانگے فوراً دے دیے اور کبھی تقاضا نہ کیا۔

ٹریم میں جب میں نے اس روز مرہٹی لڑکی کو اپنی سیٹ دی تو اس نے کتنی پیاری شکر گزاری سے کہا تھا ''تھینک یو''۔

پھر وہ موٹے پارسی کی طرف دیکھتا۔ اس کے چہرے پر یہ بڑی ناک اس کو نظر آتی۔ مجید پھر سوچتا ''یہ کیا بات ہے ان پارسیوں کی ناکوں کے ساتھ اتنا برا سلوک کیوں کیا گیا ہے..... کتنی کوفت ہو رہی ہے اس ناک سے فوراً ہی یہ خیال آتا کہ یہ

پارسی بڑا نیک آدمی ہے کیونکہ وہ اس کو ادھار دے دیتا تھا۔ جب اس کی جیب میں پیسے نہ ہوتے تو وہ کاؤنٹر کے پاس جاتا اور اس سے کہتا ''سیٹھ آج مال پانی نہیں ..... کل''۔

بیئر کی بوتل چودہ آنے میں آتی تھی۔ اس کو خالی کر کے اور پلیٹیں صاف کر کے وہ ہاتھ کے بڑے خوبصورت اشارے سے بیرے سے کہتا ''باقی دو آنے تم اپنے پاس رکھو''۔

بیرا سلام کرتا۔ مجید بے حد مسرور اور شادماں اٹھتا اور پارسی سیٹھ کو ''صاحب جی'' کہہ کر دفتر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کے قدم رک جاتے۔ پڑوس کی گلی میں ایک چھوٹی سی تاریک کھولی میں مس لینا رہتی تھی۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور ڈانسر تھی مگر اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ یہودن تھی۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ الیتھر اور ہیلن الیتھر سولہ برس کی تھی اور ہیلن تیرہ برس کی۔ دونوں رات کو اپنی ماں کے پاس ایک لمبا کرتہ پہنے لیٹی ہوتی تھیں۔ صرف ایک پلنگ تھا۔ مس لینا فرش پر چٹائی بچھا کر سوتی تھی۔

رات کو بیئر پی کر مس لینا کے ہاں جانا مجید کا معمول بن گیا تھا۔ وہ باہر ہوٹل والے کو تین چائے کا آرڈر دے کر گلی میں داخل ہوتا اور مس لینا کی کھولی میں پہنچ جاتا۔ اندر ٹین کی کپی جل رہی ہوتی۔ الیتھر اور ہیلن قریب قریب نیم برہنہ ہوتیں۔ مجید پہنچتا تو زور سے پکارتا ''السلام علیکم''۔

ماں بیٹیاں ٹھیٹ عربی لہجے میں وعلیکم السلام کہتیں اور وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھ جاتا اور مس لینا سے کہتا ''چائے کا آرڈر دے آیا ہوں''۔

ایلتھر باریک آواز میں کہتی ''تھینک یو''۔ چھوٹی بستر پر لوٹیں لگانا شروع کر دیتی۔ مجید کو اس کی آڑو آڑو جتنی چھاتیوں اور ننگی ٹانگوں کی کئی جھلکیاں دکھائی دیتیں جو اس کے مسرور و مخمور دماغ کو بڑی فرحت بخشتیں۔

باہر والا چائے لے کر آتا تو ماں بیٹیاں پینا شروع کر دیتیں۔ مجید خاموش بیٹھا رہتا۔ اس تنگ و تار ماحول میں ایک عجیب و غریب سکون اس کو محسوس ہوتا۔ وہ چاہتا کہ ان تینوں کا شکریہ ادا کرے۔ اس دھواں دینے والی کپی کا بھی شکریہ ادا کرے جو دھیمی دھیمی روشنی پھیلا رہی ہے۔ وہ لوہے کی اس کرسی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ جس نے اس کو نشست پیش کی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ماں بیٹیاں کے پاس بیٹھتا۔ دونوں لڑکیاں خوبصورت تھیں۔ ان کی خوبصورتی مجید کی آنکھوں میں بڑی پیاری نیند لے کر آتی۔ رخصت لے کر وہ اٹھتا اور جھومتا جھامتا اپنے دفتر پہنچ جاتا اور کپڑے بدل کر بنچ پر لیٹتا اور لیٹتے ہی خوشگوار اور پرسکون نیند کی گہرائیوں میں اتر جاتا۔

فرصت کے اوقات میں وسکی کے تین چار پیگ پی کر جب مجید اس زمانے کو یاد کرتا تو کچھ عرصے کے لیے یہ سب کچھ بھول کر اس میں محو ہو جاتا۔ نشہ کم ہوتا تو وہ بلیک مارکیٹ کے متعلق سوچنے لگتا۔ روپیہ کمانے کے نئے ڈھنگ تخلیق کرتا۔ ان عورتوں کے متعلق غور کرتا جن سے وہ جنسی رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔

مجید کا ماضی جنگ سے پہلے کی فصل میں گم ہو چکا تھا..... ایک مدھ سی لکیر رہ گئی تھی جس کو مجید اب دولت سے پیٹ رہا تھا۔

☆☆☆

محمودہ

مستقیم نے محمودہ کو پہلی مرتبہ اپنی شادی پر دیکھا۔ آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی کہ اچانک اس کو دو بڑی بڑی..... غیر معمولی طور پر بڑی آنکھیں دکھائی دیں..... یہ محمودہ کی آنکھیں تھیں جو ابھی تک کنواری تھیں۔

مستقیم عورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا تھا..... محمودہ کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اسے قطعاً محسوس نہیں ہوا کہ آرسی مصحف کی رسم کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔ اس کی دلہن کیسی تھی۔ یہ بتانے کے لیے اس کو موقع دیا گیا۔ مگر محمودہ کی آنکھیں اس کی دلہن اور اس کے درمیان ایک سیاہ مخملیں پردے کے مانند حائل ہو گئیں۔

اس نے چوری چوری کئی مرتبہ محمودہ کی طرف دیکھا۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں سب چہچہا رہی تھیں۔ مستقیم سے بڑے زوروں کی چھیڑ خانی ہو رہی تھی۔ مگر وہ الگ تھلگ کھڑکی کے پاس گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے خاموش بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گورا تھا۔ بال تختیوں پر لکھنے والی سیاہی کے مانند کالے اور چمکیلے تھے۔ اس نے سیدھی مانگ نکال رکھی تھی جو اس کے بیضوی چہرے پر بہت جچتی تھی۔ مستقیم کا اندازہ یہ تھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے چنانچہ جب وہ اٹھی تو اس کی تصدیق ہو گئی۔

لباس بہت معمولی قسم کا تھا۔ دوپٹہ جب اس کے سر سے ڈھلکا اور فرش تک جا پہنچا تو مستقیم نے دیکھا کہ اس کا سینہ بہت ٹھوس اور مضبوط ہے۔ بھرا بھرا جسم تیکھی

ناک چوڑی پیشانی چھوٹا سا لب دہان..... اور آنکھیں..... جو دیکھنے والے کو سب سے پہلے دکھائی دیتی تھیں۔

مستقیم اپنی دلہن گھر لے آیا..... دو تین مہینے گزر گئے۔ وہ خوش تھا اس لیے کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت اور باسلیقہ تھی..... لیکن وہ محمودہ کی آنکھیں نہیں بھول سکا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے دل و دماغ پر مرتسم ہو گئی ہیں۔

مستقیم کو محمودہ کا نام نہیں معلوم تھا..... ایک دن اس نے اپنی بیوی کلثوم سے بر سبیل تذکرہ پوچھا ''وہ..... وہ لڑکی کون تھی ہماری شادی پر..... جب آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی وہ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی''۔

کلثوم نے جواب دیا ''میں کیا کہہ سکتی ہوں..... اس وقت کئی لڑکیاں تھیں۔ معلوم نہیں آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں''۔

مستقیم نے کہا ''وہ..... وہ جس کی یہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں''۔

کلثوم سمجھ گئی۔ ''اوہ..... آپ کا مطلب محمودہ سے ہے..... ہاں واقعی اس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں، لیکن بری نہیں لگتیں..... غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ بہت کم گو اور شریف ہے..... کل ہی اس کی شادی ہوئی ہے''۔

مستقیم کو غیر ارادی طور پر ایک دھچکا سا لگا ''اس کی شادی ہو گئی کل؟''

''ہاں..... میں کل وہیں تو گئی تھی..... میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ میں نے اس کو ایک انگوٹھی دی ہے''۔

''ہاں ہاں..... مجھے یاد آ گیا..... لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم جس سہیلی کی شادی پر جا رہی ہو وہی لڑکی ہے بڑی بڑی آنکھوں والی..... کہاں شادی ہوئی ہے

اس کی؟''

کلثوم نے گلوری بنا کر اپنے خاوند کو دیتے ہوئے کہا ''اپنے عزیزوں میں..... خاوند اس کا ریلوے ورکشاپ میں کام کرتا ہے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہے..... سنا ہے بے حد شریف آدمی ہے''۔

مستقیم نے گوری کلے کے نیچے دبائی ''چلو اچھا ہو گیا..... لڑکی بھی جیسا کہ تم کہتی ہو شریف ہے''۔

کلثوم سے رہا نہ گیا۔ اسے تعجب تھا کہ اس کا خاوند محمودہ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے ''حیرت ہے آپ نے اس کو محض ایک نظر دیکھنے پر بھی یاد رکھا''۔

مستقیم نے کہا ''اس کی آنکھیں ہی کچھ ایسی ہیں کہ آدمی بھول نہیں سکتا..... کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟''

کلثوم دوسرا پان بنا رہی تھی۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ اپنے خاوند سے مخاطب ہوئی ''میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے تو اس کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی..... مرد جانے کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں''۔

مستقیم نے مناسب خیال کیا کہ اس موضوع پر اب مزید گفتگو نہیں ہونی چاہیے چنانچہ جواب میں مسکرا کر وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا..... اتوار کی چھٹی تھی حسب معمول اسے اپنی بیوی کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے جانا چاہیے تھا مگر محمودہ کا ذکر چھیڑ کر اس نے اپنی طبیعت مکدر کر لی تھی۔

اس نے آرام دہ کرسی میں لیٹ کر تپائی پر سے ایک کتاب اٹھائی جسے وہ دو مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ پہلا ورق نکالا اور پڑھنے لگا۔ مگر حروف گڈمڈ ہو کر محمودہ کی

آنکھیں بن جاتے۔ مستقیم نے سوچا ''شاید کلثوم ٹھیک کہتی تھی کہ اسے محمودہ کی آنکھوں مین کوئی کشش نظر نہیں آتی..... ہو سکتا ہے کسی اور مرد کو بھی نظر نہ آئے..... ایک صرف میں ہوں جسے دکھائی دی ہے..... پر کیوں؟..... میں نے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا..... میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ میرے لیے پرکشش بن جائیں..... ایک لحظے کی تو بات تھی۔ بس میں نے ایک نظر دیکھا اور وہ میرے دماغ پر چھا گئیں۔ اس میں نہ ان آنکھوں کا قصور ہے نہ میری آنکھوں کا جن سے میں نے انہیں دیکھا''۔

اس کے بعد مستقیم نے محمودہ کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کیا ''تو ہو گئی اس کی شادی..... چلو اچھا ہوا..... لیکن دوست کیا بات ہے کہ تمہارے دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے..... کیا تم چاہتے ہو کہ اس کی شادی نہ ہو..... سدا کنواری رہے کیونکہ تمہارے دل میں اس سے شادی کرنے کی خواہش تو کبھی پیدا نہیں ہوئی تم نے اس کے متعلق کبھی ایک لحظے کے لیے بھی نہیں سوچا پھر یہ جلن کیسی؟..... اتنی دیر تمہیں اسے دیکھنے کا بھی خیال نہ آیا پر اب تم کیوں اسے دیکھنا چاہتے ہو..... بفرض محال دیکھ بھی لو تو کیا کر لو گے۔ اسے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لو گے..... اس کی بڑی بڑی آنکھیں نوچ کر اپنے بٹوے میں ڈال لو گے..... بولو نا کیا کرو گے؟''

مستقیم کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اصل میں اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر کچھ چاہتا بھی ہے تو کیوں چاہتا ہے۔

محمودہ کی شادی ہو چکی تھی اور وہ بھی صرف ایک روز پہلے۔ یعنی اس وقت

جب کہ مستقیم کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا محمودہ یقیناً دلہنوں کے لباس میں یا تو اپنے میکے یا اپنی سسرال میں شرمائی لجائی بیٹھی تھی..... وہ خود شریف تھی اس کا شوہر بھی شریف تھا ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا..... بڑی خوشی کی بات تھی۔ مستقیم کی دلی خواہش تھی کہ وہ خوش رہے..... ساری عمر خوش رہے..... لیکن اس کے دل میں نہ جانے کیوں ایک ٹیس سی اٹھتی تھی اور اسے بے قرار بنا جاتی تھی۔

مستقیم آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب بکواس ہے۔ اسے محمودہ کے متعلق قطعاً سوچنا نہیں چاہیے..... دو برس گزر گئے۔ اس دوران میں اسے محمودہ کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا اور نہ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ اور اس کا خاوند بمبئی میں ڈونگری کی ایک گلی میں رہتے تھے۔ مستقیم گو ڈونگری سے بہت دور ماہم میں رہتا تھا لیکن اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے محمودہ کو دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن کلثوم ہی نے اس سے کہا ''آپ کی اس بڑی بڑی آنکھوں والی محمودہ کے نصیب بہت برے نکلے''۔

چونک کر مستقیم نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ''کیوں.....؟ کیا ہوا؟''

کلثوم نے گلوری بناتے ہوئے کہا ''اس کا خاوند ایک دم مولوی ہو گیا ہے''۔

''تو اس سے کیا ہوا؟''

''آپ سن تو لیجیے..... ہر وقت مذہب کی باتیں کرتا رہتا ہے..... لیکن بڑی اوٹ پٹانگ قسم کی۔ وظیفے کرتا ہے چلے کاٹتا ہے اور محمودہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ فقیروں کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے گھر بار سے بالکل غافل ہو

گیا ہے..... ڈاڑھی بڑھالی ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی ہے کام پر کبھی جاتا ہے کبھی نہیں جاتا..... کئی کئی دن غائب رہتا ہے..... وہ بے چاری کڑھتی رہتی ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا نہیں اس لیے فاقے کرتی ہے۔ جب اس سے شکایت کرتی ہے تو آگے سے جواب یہ ملتا ہے..... فاقہ کشی اللہ تبارک وتعالیٰ کو بہت پیاری ہے''۔ کلثوم نے یہ سب کچھ ایک سانس میں کہا۔

مستقیم نے پندنیا سے تھوڑی سی چھالیا اٹھا کر منہ میں ڈالی ''کہیں دماغ تو نہیں چل گیا اس کا؟''

کلثوم نے کہا ''محمودہ کا تو یہی خیال ہے..... خیال کا اس کا یقین ہے..... گلے میں بڑے بڑے منکوں والی مالا ڈالے پھرتا ہے کبھی کبھی سفید رنگ کا چولا بھی پہنتا ہے''۔

مستقیم گلوری لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور آرام کرسی پر لیٹ کر سوچنے لگا ''یہ کیا ہوا..... ایسا شوہر تو وبال جان ہوتا ہے..... غریب کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاگل پن کے جراثیم اس کے شوہر میں شروع ہی سے موجود ہوں گے جو یہ اب ایک دم ظاہر ہوئے ہیں..... لیکن سوال یہ ہے کہ اب محمودہ کیا کرے گی۔ اس کا یہاں کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔ کچھ شادی کرنے لاہور سے آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے..... کیا محمودہ نے اپنے والدین کو لکھا ہو گا؟..... نہیں نہیں اس کے ماں باپ تو جیسا کہ کلثوم نے ایک مرتبہ کہا تھا اس کے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ شادی اسکے چچا نے کی تھی..... ڈونگری..... ڈونگری میں شاید اس کی جان پہچان کا کوئی ہو..... نہیں جان پہچان کا کوئی ہوتا تو وہ فاقے

کیوں کرتی..... کلثوم کیوں نہ اسے اپنے یہاں لے آئے..... پاگل ہوئے ہو مستقیم..... ہوش کے ناخن لو''۔

مستقیم نے ایک بار پھر ارادہ کرلیا کہ وہ محمودہ کے متعلق نہیں سوچے گا۔ اس لیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بیکار کی مغز پاشی تھی۔

بہت دنوں کے بعد کلثوم نے ایک روز اسے بتایا کہ محمودہ کا شوہر جس کا نام جمیل تھا قریب قریب پاگل ہوگیا ہے''۔

مستقیم نے پوچھا ''کیا مطلب؟''

کلثوم نے جواب دیا ''مطلب یہ کہ رات کو ایک سیکنڈ کے لیے نہیں سوتا۔ جہاں کھڑا ہے بس وہیں گھنٹوں خاموش کھڑا رہتا ہے..... محمودہ غریب روتی رہتی ہے۔ میں کل اس کے پاس گئی تھی..... بے چاری کو کئی دن کا فاقہ تھا میں بیس روپے دے آئی تھی کیونکہ میرے پاس اتنے ہی تھے''۔

مستقیم نے کہا ''اچھا کیا تم نے..... جب تک اس کا خاوند ٹھیک نہیں ہو جاتا کچھ نہ کچھ دے آیا کرو تا کہ غریب کو فاقوں کی نوبت تو نہ آئے''۔

کلثوم نے تھوڑے توقف کے بعد عجیب وغریب لہجے میں کہا ''اصل میں بات کچھ اور ہے''۔

''کیا مطلب''

''محمودہ کا خیال ہے کہ جمیل نے محض ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ وہ پاگل واگل ہرگز نہیں..... بات یہ ہے کہ وہ.....''

''وہ کیا؟''

''وہ..... عورت کے قابل نہیں..... یہ نقص دور کرنے کے لیے وہ فقیروں اور سنیاسیوں سے ٹونے ٹوٹکے لیتا رہتا ہے''۔

مستقیم نے کہا ''یہ بات تو پاگل ہونے سے زیادہ افسوسناک ہے..... محمودہ کے لیے تو یہ سمجھو کہ ازدواجی زندگی ایک خلا بن کر رہ گئی ہے!

مستقیم اپنے کمرے میں چلا گیا اور بیٹھ کر محمودہ کی حالت زار کے متعلق سوچنے لگا۔ ایسی عورت کی زندگی کیا ہوگی جس کا شوہر بالکل صفر ہو..... کتنے ارمان ہوں گے اس کے سینے میں۔ اس کی جوانی نے کتنے کپکپا دینے والے خواب دیکھے ہوں گے..... اس نے اپنی سہیلیوں سے کیا کچھ نہیں سنا ہوگا..... کتنی ناامیدی ملی ہوگی غریب کو جب اسے چاروں طرف خلا ہی خلا نظر آیا ہوگا..... اس نے اپنی گود ہری ہونے کے متعلق بھی کئی بار سوچا ہوگا..... جب ڈونگری میں کسی کے ہاں..... بچہ پیدا ہونے کی اطلاع اسے ملتی ہوگی تو بیچاری کے دل پر ایک گھونسا سا لگتا ہوگا..... اب کیا کرے گی..... ایسا نہ ہو خودکشی کر لے..... دو برس تک اس نے کسی کو یہ راز نہ بتایا مگر اس کا سینہ پھٹ پڑا خدا اس کے حال پر رحم کرے''۔

بہت دن گزر گئے۔ مستقیم اور کلثوم چھٹیوں میں پنچ گنی چلے گئے۔ دونوں ڈھائی مہینے رہے واپس آئے تو ایک مہینے کے بعد کلثوم کے ہاں لڑکا پیدا ہوا..... وہ محمودہ کے ہاں نہ جا سکی..... لیکن ایک دن اس کی ایک سہیلی جو محمودہ کو جانتی تھی اس کو مبارکباد دینے کے لیے آئی..... اس نے باتوں باتوں میں کلثوم سے کہا ''کچھ سنا تم نے..... وہ محمودہ ہے نا بڑی بڑی آنکھوں والی''۔

کلثوم نے کہا ''ہاں ہاں..... ڈونگری میں رہتی ہے''۔

''خاوند کی بے پروائی نے غریب کو بری باتوں پر مجبور کر دیا'' کلثوم کی سہیلی کی آواز میں درد تھا۔

کلثوم نے بڑے دکھ سے پوچھا ''کیسی بری باتوں پر؟''

''اب اس کے یہاں غیر مردوں کا آنا جانا شروع ہو گیا ہے''۔

''جھوٹ'' کلثوم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

کلثوم کی سہیلی نے کہا ''نہیں کلثوم میں جھوٹ نہیں بولتی..... میں پرسوں اس سے ملنے گئی تھی دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک نوجوان مرد جو میمن معلوم ہوتا تھا باہر نکلا اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اس سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور واپس چلی آئی''۔

''یہ تم نے بہت بری خبر سنائی..... خدا اس کو گناہ کے راستے سے بچائے رکھے..... ہو سکتا ہے وہ میمن اس کے خاوند کا کوئی دوست ہو''۔ کلثوم نے خود کو فریب دیتے ہوئے کہا۔

اس کی سہیلی مسکرائی ''دوست چوروں کی طرف دروازہ کھول کر بھاگا نہیں کرتے''۔

کلثوم نے اپنے خاوند سے بات کی تو اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ کبھی نہیں رویا تھا پر جب کلثوم نے یہ اندوہناک بات بتائی کہ محمودہ نے گناہ کا راستہ اختیار کر لیا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ محمودہ ان کے یہاں رہے گی چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا ''یہ بڑی خوفناک بات ہے..... تم ایسا کرو ابھی جاؤ اور محمودہ کو یہاں لے آؤ''۔

کلثوم نے بڑے روکھے پن سے کہا ''میں اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی''۔

''کیوں؟'' مستقیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

''بس میری مرضی..... وہ میرے گھر میں کیوں رہے..... لیے کہ آپ کو اس کی آنکھیں پسند ہیں؟'' کلثوم کے بولنے کا انداز بہت زہریلا اور طنزیہ تھا۔

مستقیم کو بہت غصہ آیا مگر پی گیا۔ کلثوم سے بحث کرنا فضول تھا۔ ایک صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کلثوم کو نکال کر محمودہ کو لے آئے..... مگر وہ ایسے اقدام کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مستقیم کی نیت قطعاً نیک تھی۔ اس کو خود اس کا احساس تھا۔ دراصل اس نے کسی گندے زاویہ نگاہ سے محمودہ کو دیکھا ہی نہیں تھا..... البتہ اس کی آنکھیں واقعی اس کو پسند تھیں اتنی کہ وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔

وہ گناہ کا راستہ اختیار کر چکی تھی۔ ابھی اس نے صرف چند قدم اٹھائے تھے۔ اس کو تباہی کے غار سے بچایا جا سکتا تھا..... مستقیم نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی کبھی روزہ نہیں رکھا تھا کبھی خیرات نہیں دی تھی..... خدا نے اس کو کتنا اچھا موقع دیا تھا کہ وہ محمودہ کو گناہ کے رستے پر سے گھسیٹ کر لے آئے اور طلاق وغیرہ دلوا کر اس کی کسی اور سے شادی کرا دے..... مگر وہ یہ ثواب کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ بیوی کا دبیل تھا۔

بہت دیر تک مستقیم کا ضمیر اس کو سرزنش کرتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اسنے کوشش کی کہ اس کی بیوی رضامند ہو جائے۔ مگر جیسا کہ مستقیم کو معلوم تھا ایسی کوشش لاحاصل تھی۔

مستقیم کا خیال تھا کہ اور کچھ نہیں تو کلثوم محمودہ سے ملنے ضرور جائے گی۔ مگر اس کو ناامیدی ہوئی۔ کلثوم نے اس روز سے محمودہ کا نام تک نہ لیا۔

اب کیا ہو سکتا ہے..... مستقیم خاموش ہو رہا۔

قریب قریب دو برس گزر گئے۔ ایک دن گھر سے نکل کر مستقیم ایسے ہی تفریحاً فٹ پاتھ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس نے قصائیوں کی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور کی کھولی کے باہر تھڑے پر محمودہ کی آنکھوں کی جھلک دیکھی۔ مستقیم دو قدم آگے نکل گیا تھا۔ فوراً مڑ کر اس نے غور سے دیکھا..... محمودہ ہی تھی۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں۔ وہ ایک یہودنی کے ساتھ جو اس کھولی میں رہتی تھی باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

اس یہودن کو سارا ماہم جانتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا کام عیاش مردوں کے لیے جوان لڑکیاں مہیا کرنا تھا۔ اس کی اپنی دو جوان بیٹیاں تھیں جن سے وہ پیشہ کراتی تھی۔ مستقیم نے جب محمودہ کا چہرہ نہایت ہی بے ہودہ میک اپ کیا ہوا دیکھا تو وہ لرز اٹھا۔ زیادہ دیر تک یہ اندوہناک منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی..... وہاں سے فوراً چل دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے کلثوم سے اس واقعے کا ذکر نہ کیا..... کیونکہ اس کی اب ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ محمودہ اب مکمل عصمت فروش عورت بن چکی تھی..... مستقیم کے سامنے جب بھی اس کا بے ہودہ اور فحش طور پر میک اپ کیا ہوا چہرہ آتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اس کا ضمیر اس سے کہتا "مستقیم جو کچھ تم نے دیکھا ہے اس کے باعث تم ہو..... کیا ہوا تھا اگر تم اپنی بیوی کی چند روز کی ناراضگی اور خفگی برداشت کر لیتے۔ زیادہ سے زیادہ جس میں وہ اس وقت دھنسی ہوئی ہے..... کیا تمہاری نیت نیک نہیں تھی..... اگر تم سچائی پر رہتے تو کلثوم ایک نہ

ایک دن اپنے آپ ٹھیک ہو جاتی..... تم نے بڑا ظلم کیا..... بہت بڑا گناہ کیا''۔

مستقیم اب کیا کر سکتا تھا..... کچھ بھی نہیں..... پانی سر سے گزر چکا تھا۔ چڑیاں سارا کھیت چگ گئی تھیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مرتے ہوئے مریض کو دم آخریں اوکسیجن سنگھانے والی بات تھی۔

تھوڑے دنوں بعد بمبئی کی فضا فرقہ وارانہ فسادات کے باعث بڑی خطرناک ہو گئی۔ بٹوارے کے باعث ملک کے طول وعرض میں تباہی اور غارتگری کا بازار گرم تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے۔ کلثوم نے مستقیم کو مجبور کیا کہ وہ بھی بمبئی چھوڑ دے..... چنانچہ جو پہلا جہاز ملا اس کی سیٹیں بک کرا کے میاں بیوی کراچی پہنچ گئے اور چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا۔

ڈھائی برس بعد یہ کاروبار ترقی کر گیا' اس لیے مستقیم نے ملازمت کا خیال ترک کر دیا..... ایک روز شام کو دکان سے اٹھ کر وہ ٹہلتا ٹہلتا صدر جا نکلا..... جی چاہا کہ ایک پان کھائے۔ بیس تیس قدم کے فاصلے پر اسے ایک دکان نظر آئی جس پر کافی بھیڑ تھی۔ آگے بڑھ کر وہ دکان کے پاس پہنچا..... کیا دیکھتا ہے کہ محمودہ بیٹھی پان لگا رہی تھی۔ جھلسے ہوئے چہرے پر اسی قسم کا فحش میک اپ ہے۔ لوگ اسے گندے گندے مذاق کر رہے ہیں اور وہ ہنس رہی ہے..... مستقیم کے ہوش وحواس غائب ہو گئے۔ قریب تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے کہ محمودہ نے اسے پکارا ''ادھر آؤ دولھا میاں..... تمہیں ایک فسٹ کلاس پان کھلائیں..... ہم تمہاری شادی میں شریک تھے''۔

مستقیم بالکل پتھرا گیا۔

☆☆☆

مسز ڈی کوسٹا

نو مہینے پورے ہو چکے تھے۔

میرے پیٹ میں اب پہلی سی گڑگڑ نہیں تھی۔ پر مسز ڈی کوسٹا کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ بہت پریشان تھی۔ چنانچہ آنے والی حادثے کی تمام انجانی تکلیفیں بھول گئی تھی اور مسز ڈی کوسٹا کی حالت پر رحم کھانے لگی تھی۔

مسز ڈی کوسٹا میری پڑوسن تھی۔ ہمارے فلیٹ کی بالکونی اور اس کے فلیٹ کی بالکنی میں صرف ایک چوبی تختہ حائل تھا جس میں بے شمار ننھے ننھے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں میں سے میں اور اللہ بخشے میری ساس ڈی کوسٹا کے سارے خاندان کو کھانا کھاتے دیکھا کرتے تھے۔ لیکن جب ان کے ہاں سکھائی ہوئی جھینگا مچھلی پکتی اور اس کی ناقابل برداشت بو ان سوراخوں میں سے چھن چھن کر ہم تک پہنچ جاتی تو میں اور میری ساس بالکنی کا رخ نہ کرتے تھے۔ میں اب بھی کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنی بدبودار چیز کھائی کیونکر جا سکتی ہے۔ پر بابا کیا کہا جائے انسان بری چیزیں کھا جاتا ہے۔ کون جانے انہیں ناقابل برداشت بو ہی میں لطف آتا ہو۔

مسز ڈی کوسٹا کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کے کٹے ہوئے بال جو اپنی سیاہی کھو چکے تھے اور جن میں بے شمار سفید دھاریاں پڑ چکی تھیں۔ اس کے چھوٹے سے سر پر گھسے ہوئے نمدے کی ٹوپی کی صورت میں پریشان رہتے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ نیا بھڑکیلے رنگ کا بہت بھونڈے طریقے سے سلا ہوا فراک پہنتی تھی تو سر پر لال لال بندکیوں والا جال بھی لگا لیتی تھی۔ جس سے اس کے

چھدرے بال اس کے سر کے ساتھ چپک جاتے تھے۔ اس حالت میں وہ درزیوں کا ایسا ماڈل دکھائی دیتی تھی جو نیلام گھر میں پڑا ہو۔

میں نے کئی بار اسے اپنے انہیں بالوں میں لہریں پیدا کرنے کی کوشش میں بھی مصروف دیکھا ہے۔ اپنے چار بیٹوں کو جن میں سے ایک تازہ تازہ فوج میں بھرتی ہوا تھا اور اپنے آپ کو ہندوستان کے حکمرانوں کی فہرست میں شامل سمجھتا تھا اور دوسرا جو ہر روز اپنی کلف لگی پتلون استری کر کے پہنتا تھا اور نیچے آ کر چھوٹی چھوٹی کرسچین لڑکیوں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا..... ناشتہ کرا دیا کرتی تھی اور اپنے بڈھے خاوند کو جو ریلوے میں ملازم تھا بالکنی سے نکل کر ہاتھ کے اشارے سے بائے بائے کرنے کے بعد فارغ ہو جاتی تھی تو اپنے سر کے ناقابل گرفت بالوں میں لہریں پیدا کرنے والے کلپ اٹکا دیا کرتی تھی اور ان کلپوں سمیت سوچا کرتی تھی کہ میرے یہاں بچہ کب پیدا ہو گا۔

وہ خود آدھے درجن بچے پیدا کر چکی تھی جن میں سے پانچ زندہ تھے۔ ان کی پیدائش پر بھی وہ یونہی دن گنا کرتی تھی یا چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی اور بچے خود بخود پیدا ہونے کے لیے چھوڑ دیتی تھی۔ اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں لیکن مجھے اس بات کا تلخ تجربہ ضرور ہے کہ جو کچھ میرے پیٹ میں تھا۔ اس سے مسز ڈی کوسٹا کو جس کا داہنا پیر اور اس کے اوپر کا حصہ کسی بیماری کے باعث ہمیشہ سوجھا رہتا تھا۔ بہت گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ دن میں کئی مرتبہ بالکنی سے جھانک کر وہ مجھے آواز دیا کرتی تھی اور گرائمر سے بے نیاز انگریزی میں جس کا نہ بولنا اس کے نزدیک شاید ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں کی ہتک تھی۔ مجھ سے کہا کرتی تھی ''میں بولی آج

تم کدھر گیا تھا.....''

جب میں اسے بتاتی تھی کہ میں اپنے خاوند کیساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی تو اس کے چہرے پا نا امیدی کے آثار پیدا ہو جاتے اور وہ انگریزی بھول کر بمبئی کی اردو میں گفتگو کرنا شروع کر دیتی۔ جس کا مقصد مجھ سے صرف اس کا پتہ لینا ہوتا تھا کہ میرے خیال کے مطابق بچے کی پیدائش میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔

مجھے اس بات کا علم ہوتا تو میں یقیناً اسے بتا دیتی۔ اس میں حرج ہی کیا تھا۔ اس بے چاری کو خواہ مخواہ کی الجھن سے نجات مل جاتی اور مجھے بھی ہر روز اس کے نت نئے سوالوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش اور اس کے متعلقات کا کچھ علم ہی نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ نو مہینے ہو جانے کے بعد بچہ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

مسز ڈی کوسٹا کے حساب کے مطابق نو مہینے ہو چکے تھے۔ میری ساس کا خیال تھا کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں لیکن یہ نو مہینے کہاں سے شروع کر کے پورے کر دیے گئے تھے میں نے بہتیرا اپنے ذہن پر زور دیا پر سمجھ نہ سکی۔

بچہ میرے پیدا ہونے والا تھا شادی میری ہوئی تھی۔ لیکن سارا بہی کھاتہ مسز ڈی کوسٹا کے پاس تھا۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ یہ میری اپنی غفلت کا نتیجہ ہے اگر میں نے کسی چھوٹی سی نوٹ بک میں چھوٹی سی نوٹ بک میں نہ سہی اس کاپی ہی میں جو دھوبی کے حساب کے لیے مخصوص تھی۔ سب تاریخیں لکھ چھوڑی ہوتیں تو کتنا اچھا تھا۔

اتنا تو مجھے یاد تھا کہ میری شادی ۲۶ اپریل کو ہوئی یونی ۲۶ کی رات کو میں اپنے

گھر کے بجائے اپنے خاوند کے گھر میں تھی لیکن اس کے بعد کے واقعات کچھ اس قدر غلط ملط ہو گئے تھے کہ اس بات کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا اور مجھے تعجب ہے کہ مسز ڈی کوسٹا نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ نو مہینے پورے ہو چکے ہیں اور بچہ لیٹ ہو گیا تھا۔

ایک روز اس نے میری ساس سے اضطراب بھرے لہجے میں کہا ''تمہارے ڈاٹران لا کا بچہ لیٹ ہو گیا ہے۔ پچھلے ایک ہفتے میں پیدا ہونا مانگتا تھا''۔

می اندر صوفے پر لیٹی تھی اور آنے والے حادثے کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ مسز ڈی کوسٹا کی یہ بات سن کر مجھے بڑی ہنسی آئی اور ایسا لگا کہ مسز ڈی کوسٹا اور میری ساس دونوں پلیٹ فارم پر کھڑی ہیں اور جس گاڑی کا انہیں انتظار تھا لیٹ ہو گئی ہے۔

اللہ بخشے میری ساس کو اتنی شدت کا انتظار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ کئی مرتبہ مسز ڈی کوسٹا سے کہہ چکی تھیں ''کوئی فکر کی بات نہیں خدا اپنا فضل کرے گا۔ کچھ دن اوپر ہو جایا کرتے ہیں''۔ مگر ڈی کوسٹا نہیں مانتی تھی جو حساب وہ لگا چکی تھی غلط کیسے ہو سکتا تھا۔ جب مسز ڈی سلوا کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے دور ہی سے دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا۔ چنانچہ چوتھے ہی روز مسز ڈی سلوا ہسپتال جاتی نظر آئی اور خود اس نے چھ بچے جنے تھے جن میں سے ایک بھی لیٹ نہ ہوا تھا اور پھر وہ نرس تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس نے کسی ہسپتال میں دایہ گیری کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر سب لوگ اسے نرس کہتے تھے۔ چنانچہ ان کے فلیٹ کے باہر چھوٹی سی چوبی تختی پر ''نرس ڈی کوسٹا'' لکھا رہتا تھا۔ اسے بچوں کی

پیدائش کے اوقات معلوم نہ ہوتے تو اور کس کو ہوتے۔

جب کمرہ نمبر ۱۷ کے رہنے والے مسٹر نذیر کی ناک سوجھ گئی تھی تو مسز ڈی کوسٹا نے بازار سے روئی کا بنڈل منگوا کر اور پانی گرم کر کے ٹکور کی تھی۔ بار بار وہ اس واقعے کو سند کے طور پر پیش کیا کرتی تھی۔ چنانچہ مجھے بار بار کہنا پڑتا تھا ''ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پڑوس میں ایسی عورت رہتی ہے جو خوش خلق ہونے کے علاوہ اعلیٰ نرس بھی ہے''۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوتی تھی اور اس کو یوں خوش کرنے سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ جب صاحب کو تیز بخار چڑھتا تھا تو مسز ڈی کوسٹا نے برف لگانے والی ربڑ کی تھیلی فوراً مجھے لا دی تھی۔ یہ تھیلی ایک ہفتہ ہمارے یہاں پڑی رہی اور ملیریا کے مختلف شکاروں کے استعمال میں آتی رہی۔ یوں بھی مسز ڈی کوسٹا بڑی خدمت گزار تھی لیکن اس کی اس رضا کاری میں اس کی متجسس طبیعت کو کافی دخل تھا۔ دراصل وہ اپنے تمام پڑوسیوں کے ان رازوں سے بھی واقف ہونے کی آرزومند تھی جو سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔

مسز ڈی سلوا چونکہ مسز ڈی کوسٹا کی ہم مذہب تھی۔ اس لیے اس کی بہت سی کمزوریاں اس کو معلوم تھیں۔ مثلاً وہ جانتی تھی کہ اس کی شادی کرسمس پر ہوئی اور بچہ جولائی میں پیدا ہوا۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس کی اصلی شادی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسز ڈی سلوا ناچ گھروں میں جاتی ہے اور یوں بہت سا روپیہ کماتی ہے اور اب وہ اتنی خوبصورت نہیں رہی تھی جتنی پہلے تھی۔ چنانچہ اس کی آمدنی بھی پہلے کی نسبت کم ہو گئی ہے۔

ہمارے سامنے جو یہودی رہتے تھے۔ ان کے متعلق مسز ڈی سلوا کے مختلف

بیان تھے۔ کبھی وہ کہتی تھی کہ موٹی موذیل جو رات کو دیر سے گھر آتی ہے۔ سٹہ کھیلتی ہے اور وہ صبح ٹھنگنا سا بڈھا جو اپنی پتلون کے گیٹسون میں انگوٹھے اٹکائے اور کوٹ کاندھے پر رکھے صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کو لوٹتا ہے موذیل کا پرانا دوست ہے۔ اس بڈھے کے متعلق اس نے یہ کھوج لگا کر معلوم کیا تھا کہ صابن بناتا ہے جس میں تیجی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ایک دن اس نے ہمیں بتایا کہ موذیل نے اپنی لڑکی کی جو بہت خوبصورت ہے اور ہر روز نیلے رنگ کا جم پہن کر سکول جاتی ہے اس آدمی سے منگنی کر رکھی ہے جو ہر روز ایک پارسی کو موٹر میں لیکر آتا ہے۔ اسی پارسی کے متعلق میں اتنا جانتی ہوں کہ اس کی موٹر ہمیشہ نیچے کھڑی رہتی تھی اور وہ موذیل کی لڑکی کے منگیتر سمیت رات وہیں بسر کرتا تھا۔ مسز ڈی کوسٹا کا بیان یہ تھا کہ موذیل کی لڑکی فلوری کا منگیتر پارسی کا موٹر ڈرائیور ہے اور یہ پاری اپنے موٹر ڈرائیور کی بہن للّی کا عاشق ہے جو اپنی چھوٹی بہن وائلٹ سمیت اسی فلیٹ میں رہتی تھی۔ وائلٹ کے متعلق مسز ڈی کوسٹا کی رائے بہت خراب تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہ لونڈیا جو ہر وقت ایک ننھے بچے کو اٹھائے رہتی ہے۔ بہت برے کریکٹر کی ہے اور اس ننھے بچے کے متعلق اس نے ایک دن ہمیں یہ خبر سنائی تھی کہ جیسا مشہور کیا گیا ہے وہ کسی پارسن کا لاوارث بچہ نہیں بلکہ خود وائلٹ کی بہن للّی کا ہے اور جو للّی ہے بس مجھے اتنا ہی یاد رہا ہے کیونکہ جو شجرہ مسز ڈی کوسٹا نے تیار کیا تھا اتنا لمبا تھا کہ شاید ہی کسی کو دوبارہ یاد رہ سکے۔

صرف آس پاس کی عورتوں اور پڑوس کے مردوں تک مسز ڈی کوسٹا کی معلومات محدود نہیں تھیں۔ اسے دوسرے محلے کے لوگوں کے متعلق بھی بہت سی

باتیں معلوم تھیں چنانچہ جب وہ اپنے سوجھے ہوئے پیر کا علاج کرانے کی غرض سے باہر جاتی تو گھر لوٹتے ہوئے دوسرے محلوں کی بہت سی خبریں لاتی تھی۔

ایک روز جب مسز ڈی کوسٹا میرے بچے کی پیدائش کا انتظار کر کے تھک ہار چکی تھی۔ میں نے اسے باہر پھاٹک کے قریب دو بڑے لڑکوں ایک لڑکی اور پڑوس کی دو عورتوں کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھا۔ یہی خیال کر کے جی ہی جی میں بہت کڑھی کہ میرے بچے کے لیٹ ہو جانے کے متعلق باتیں ہو رہی ہوں گی۔ چنانچہ جب اس نے گھر کا رخ کیا تو میں جنگلے سے پرے ہٹ گئی مگر اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ سیدھی اوپر چلی آئی۔ میں نے دروازہ کھول کر اسے باہر بالکنی ہی میں مونڈھے پر بٹھا دیا۔ مونڈھے پر بیٹھتے ہی اس نے بمبئی کی اردو اور گرائمر سے بے نیاز انگریزی میں کہنا شروع کیا ووٹم نے کچھ سنا؟..... مہاتما گاندھی نے کیا کیا..... الی کانگرس ایک نیا قانون پاس کرنا مانگتی ہے۔ میرا فریڈرک خبر لایا ہے کہ بمبئی میں پروہشین ہو جائے گی۔ تم سمجھتا ہے پروہشین کیا ہوتی ہے؟

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا کیونکہ جتنی انگریزی مجھے آتی تھی اس میں پروہشین کا لفظ نہیں تھا۔ اس پر مسز ڈی کوسٹا نے کہا ''پروہشین شراب بند کر دینے کو کہتے ہیں ہم پوچھتا ہے کہ اس کانگرس کا ہم نے کیا بگاڑا ہے کہ شراب بند کر کے ہم کو تنگ کرنا مانگتی ہے۔ یہ کیسی گونمنٹ ہے۔ ہم کو ایسی بات ایک دم اچھی نہیں لگتی۔ ہمارا تہوار کیسے چلے گا۔ ہم کیا کریں گے۔ وسکی ہمارے تہواروں میں ہونا ہی مانگتا ہے۔ تم سمجھتی ہونا؟ کرسمس کیسے ہوگا؟..... کرسچین لوگ تو اس لاء کو نہیں مانے گا۔ کیسے مان سکتا ہے۔ میرے گھر میں چوبیس کلاک (گھنٹے) برانڈی کی ضرورت

رہتی ہے۔ یہ لاء پاس ہو گیا تو کام کیسے چلے گا..... ب کچھ گاندھی کر رہا ہے..... گاندھی جو محمڈن لوگ کا ایک دم بیری ہے..... سالا آپ تو پیتا نہیں اور دوسروں کو پینے سے روکتا ہے اور تمہیں مالوم ہے یہ ہم لوگوں کا میرا مطلب ہے گورنمنٹ کا بہت بڑا اینی می (دشمن) ہے"۔

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان کا سارا آپو مسز ڈی کوسٹا کے اندر سما گیا ہے۔ وہ گوآ کی رہنے والی کالے رنگ کی کرسچین عورت تھی مگر جب اس نے یہ باتیں کیں تو میرے تصور نے اس پر سفید چمڑی منڈھ دی۔ چند لمحات کے لیے وہ یورپ سے آئی ہوئی تازہ تازہ انگریز عورت دکھائی دی جسے ہندوستان اور اس کے مہاتما گاندھی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

سمندر کے پانی سے نمک بنانے کی تحریک مہاتما گاندھی نے شروع کی تھی۔ چونکہ چرخہ چلانا اور کھدر کر پہننا بھی اسی نے لوگوں کو سکھایا تھا۔ اس قسم کی اور بہت سی اوٹ پٹانگ باتیں وہ کر چکا تھا۔ شاید اسی لیے مسز ڈی کوسٹا نے یہ سمجھا تھا کہ بمبئی میں شراب صرف اس لیے بند کی جا رہی ہے کہ انگریز لوگوں کو تکلیف ہو۔ وہ کانگرس اور مہاتما گاندھی کو ایک ہی چیز سمجھتی تھی یعنی لنگوٹی۔

مہاتما گاندھی اور اس کی ہشت پشت پر لعنتیں بھیج کر مسز ڈی کوسٹا اصل بات کی طرف متوجہ ہوئی "اور ہاں یہ تمہارا بچہ کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ چلو میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں"۔

میں نے اس وقت بات ٹال دی۔ مگر مسز ڈی کوسٹا گھر جاتے ہوئے پھر مجھ سے کہا "دیکھو تم کو کچھ ایسا ویسا بات ہو گیا تو پھر ہم کو نہ بولنا"۔

اس سے دوسرے روز کا واقعہ ہے کہ صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے خیال آیا کئی دنوں سے میں نے مسز کاظمی کو ٹیلیفون نہیں کیا۔ اس کو بھی بچے کی پیدائش کا بہت خیال ہے۔ اس وقت فرصت ہے اور نذیر صاحب کا دفتر جوان کے گھر کے ساتھ ہی ملحق ہے بالکل خالی ہوگا کیونکہ چھ بج چکے تھے۔ اٹھ کر ٹیلی فون کر دینا چاہیے۔ یوں سیڑھیاں اترنے اور چڑھنے سے ڈاکٹر صاحب اور تجربہ کار عورتوں کے مشورہ پر عمل بھی ہو جائے گا۔ جو یہ تھا کہ چلنے پھرنے سے بچہ آسانی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اپنے پیدا ہونے والے بچے سمیت اٹھی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب پہلی منزل پر پہنچی تو مجھے نرس ڈی کوسٹا کا بورڈ نظر آیا اور بیشتر اس کے کہ میں اس کے فلیٹ کے دروازے سے گزر کر دوسری منزل کے پہلے زینے پر قدم رکھوں۔ مسز ڈیکوسٹا باہر نکل آئی اور مجھے گھر لے گئی۔

میرا دم پھولا ہوا تھا اور پیٹ میں اینٹھن سی پیدا ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ربڑ کی گیند ہے جو کہیں اٹک گئی ہے۔ اس سے بڑی الجھن پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار اس تکلیف کا ذکر اپنی ساس سے کیا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ بچے کی ٹانگ ادھر ادھر پھنس جایا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ ٹانگ وانگ ہی ہلنے سے کہیں پھنس گئی تھی۔ جس کے باعث مجھے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔

میں نے مسز ڈی کوسٹا سے کہا مجھے ایک ضروری ٹیلیفون کرنا ہے۔ اسی لیے میں آپ کے یہاں نہیں بیٹھ سکتی اور بہت سے چھوٹے بہانے میں نے پیش کیے۔ مگر وہ نہ مانی اور میرا بازو پکڑ کر اس نے زبردستی مجھے اس صوفے پر بٹھا دیا جس کا کپڑا بہت میلا ہو رہا تھا۔

مجھے صوفے پر بٹھا کر جلدی جلدی اس نے دوسرے کمرے سے اپنے دو چھوٹے لڑکوں کو باہر نکالا۔ اپنی کنواری جوان لڑکی کو جو مہاتما گاندھی کی لنگوٹی سے کچھ بڑی نیکر پہنتی تھی۔ اس نے باہر بھیج دیا اور مجھے خالی کمرے میں لے گئی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے اس نے میری طرف افریقی جادوگر کی طرح دیکھا جس نے الہ دین کا چچا بن کر اسے غار میں بند کر دیا تھا۔

یہ سب کچھ اس نے اتنی پھرتی سے کیا کہ مجھے وہ بہت پراسرار دکھائی دے رہی تھی۔ سوجے ہوئے پیر کے باعث اس کی چال میں خفیف سا لنگڑا پن پیدا ہو گیا تھا جو مجھے اس وقت بہت بھیانک دکھائی دیا۔

میری طرف گھور کر دیکھنے کے بعد اس نے ادھر دیوار کی تینوں کھڑکیاں بند کر دیں۔ ہر کھڑکی چٹخنی چڑھا کر اس نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا اسے اس بات کا ڈر ہے کہ میں اٹھ کر بھاگوں گی۔

ایمان کی کہوں اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ دروازہ کھول کر بھاگ جاؤں اس کی خاموشی اور اس کے کھڑکیاں دروازے بند کرنے سے میں بہت پریشان ہو گئی تھی آخر اس کا مطلب کیا تھا؟..... وہ چاہتی کیا تھی؟ اتنے زبردست تخلیے کی کیا ضرورت تھی؟..... اور پھر..... وہ لاکھ پڑوسن تھی اس کے ہم پر کئی احسان تھے لیکن آخر وہ تھی تو ایک غیر عورت اور اس کے بیٹے..... وہ موا فوجی اور وہ کلف لگی پتلون والا جو چھوٹی چھوٹی کرسچین لڑکیوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا..... اپنے اپنے ہوتے ہیں اور پرائے پرائے۔ میں کئی عشقیہ ناولوں میں کنٹینوں کا حال پڑھ چکی تھی۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ نرس ورس بالکل نہیں ہے۔ بلکہ بہت

بڑی گلنی ہے۔ کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باعث کمرے میں جس کے اندر لوہے کے چار پلنگ پڑے تھے کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ جس سے مجھے اور بھی وحشت ہوئی۔ مگر اس نے فوراً ہی بٹن دبا کر روشنی کر دی۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرے گی۔ پراسرار طریقے سے اس نے آتشدان سے ایک بوتل اٹھائی جس میں سفید رنگ کا سیال مادہ تھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی ''اپنا بلاؤز اتارو..... میں کچھ دیکھنا چاہتی ہوں''۔

میں گھبرا گئی ''کیا دیکھنا چاہتی ہو؟''

اوپر سے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ پھر بلاؤز اتروانے کا کیا مطلب تھا اور اسے کیا حق حاصل تھا کہ وہ دوسری عورتوں کو یوں گھر کے اندر بلا کر بلاؤز اتروانے پر مجبور کرے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا ''مسز ڈی کوسٹا میں بلاؤز ہرگز نہیں اتاروں گی'' میرے لہجے میں گھبراہٹ کے علاوہ تیزی بھی تھی۔

مسز ڈی کوسٹا کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ''تو..... تو..... ہم کو معلوم کیسے ہو گا کہ تمہارے گھر میں بچہ کب ہو گا..... اس بوتل میں کھوپرے کا تیل ہے۔ یہ ہم تمہارے پیٹ پر گرا کر دیکھے گا..... اس سے ایک دم معلوم ہو جائے گا کہ بچہ کب ہو گا..... لڑکی ہو گی یا لڑکا''۔

میری گھبراہٹ دور ہو گئی۔ مسز ڈی کوسٹا مجھے مسز ڈی کوسٹا نظر آنے لگیں۔

کھوپری کا تیل بڑی بے ضرر چیز ہے۔ پیٹ پر اگر اس کی پوری بوتل بھی انڈیل دی جاتی تو کیا حرج تھا اور پھر ترکیب کتنی دلچسپ تھی۔ اس کے علاوہ اگر میں نہ مانتی تو مسز ڈی کوسٹا کو کتنی بڑی ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا مجھے ویسی بھی کسی

کی دل شکنی منظور نہیں ہوتی چنانچہ میں مان گئی۔ بلاؤز اور قمیص اتارنے میں مجھے کافی کوفت ہوئی۔ مگر میں نے برداشت کر لی غیر عورت کی موجودگی میں جب میں نے اپنا پھولا ہوا پیٹ دیکھا جس کے نچلے حصے پر اس طرح کے لال لال نشان بنے ہوئے تھے جیسے ریشمی کپڑے میں چرسیں پڑ پڑ جائیں تو مجھے ایک عجیب قسم کا حجاب محسوس ہوا۔ میں نے چاہا کہ فوراً کپڑے پہن لوں اور وہاں سے چل دوں ۔لیکن مسز ڈی کوسٹا کا وہ ہاتھ جس میں کھوپرے کے تیل کی بوتل تھی اٹھ چکا تھا۔

میرے پیٹ پر ٹھنڈے تیل کی ایک لکیر دوڑ گئی۔ مسز ڈی کوسٹا خوش ہو گئی۔ میں نے جب کپڑے پہن لیے تو اس نے مطمئن لہجہ میں کہا ''آج کیا ڈیٹ ہے؟ گیارہ گیارہ بس پندرہ کو بچہ ہو جائے گا اور لڑکا ہو گا''۔

بچہ ۲۵ تاریخ کو ہوا لیکن تھا لڑکا اب جب کبھی وہ میرے پیٹ پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ رکھتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسز ڈی کوسٹا نے کھوپرے کے تیل کی ساری بوتل انڈیل دی ہے۔

☆☆☆

مسٹر حمیدہ

رشید نے پہلی مرتبہ اسے بس اسٹینڈ پر دیکھا..... جہاں وہ شیڈ کے نیچے کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی..... رشید نے جب اسے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے حیرت میں گم ہو گیا..... اس سے قبل اس نے کوئی ایسی لڑکی نہیں دیکھی تھی جس کے چہرے پر مردوں کی مانند ڈاڑھی اور مونچھیں ہوں۔

پہلے رشید نے سوچا کہ شاید اس کی نگاہوں نے غلطی کی ہے۔ عورت کے چہرے پر بال کیسے اگ سکتے ہیں..... پر جب اس نے غور سے دیکھا تو اس لڑکی نے باقاعدہ شیو کر رکھی تھی اور سرمئی غبار اس کے گالوں اور ہونٹوں پر موجود تھا۔

رشید سمجھا کہ شاید ہیجڑہ ہو مگر نہیں..... وہ ہیجڑہ نہیں تھی..... اس لیے کہ اس میں ہیجڑوں کی سی مصنوعی نسوانیت کے کوئی آثار نہیں تھے..... وہ مکمل عورت تھی..... ناک نقشہ بہت اچھا تھا..... کولہے چوڑے چکلے..... کمر پتلی سینہ جوانی سے بھرپور..... بازو سڈول..... غرضیکہ اس کے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر نسوانیت کا عمدہ نمونہ تھا۔

ایک صرف اس کی ڈاڑھی اور مونچھوں نے سب کچھ غارت کر دیا تھا..... رشید سوچنے لگا..... قدرت کی یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک اچھی بھلی نوجوان خوبصورت لڑکی کو بدنما بنا دیا۔

رشید کے دماغ میں کئی خیال اوپر تلے آئے اور وہ بوکھلا گیا۔

وہ سوچتا تھا۔

''کیا اس لڑکی کی زندگی اجیرن ہو کے نہیں رہ گئی''۔

''صبح اٹھ کر جب اسے استرا پکڑ کر شیو کرنا پڑتی ہو گی تو اسے کیا محسوس ہوتا ہو گا..... کیا اس وقت اس کے جی میں جھنجھلا کر انتقامی خواہش پیدا نہ ہوتی ہو گی کہ وہ گھس کھدے کی طرح اپنے گال اور ہونٹ چھیل ڈالے''۔

ایک عورت کے لیے یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ خار پشت کی مانند اس کے گالوں پر دوسرے روز نوکیلے بال اگ آئیں۔

اگر مردوں کی مانند عورتوں کے بھی ڈاڑھی مونچھ آ گئی تو کوئی حرج نہیں تھا پر یہاں ازل سے عورتیں ان بالوں سے بے نیاز ہی رہی ہیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں..... عورتوں کے چہرے پر بالوں کا ہونا کوئی معیوب چیز نہیں..... لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم لوگ دیکھنے کے عادی نہیں۔

صنف نازک آخر صنف نازک ہے..... اس میں کوئی شک نہیں..... اس لڑکی میں نسوانیت کے تمام جوہر موجود ہیں۔ پھر یہ ڈاڑھی مونچھ کس لیے اگ آئی ہے..... نظر بٹو کے طور پر..... اس کی کوئی تشریح و توضیح تو ہونی چاہیے بیکار میں ایک خوبصورت شے کو بھونڈا بنا دیا..... یہ کہاں کی شرافت ہے۔

اب ایسی لڑکی سے شادی کون کرے گا۔ جو ہر روز صبح سویرے اٹھ کر استرا ہاتھ میں پکڑ کر شیو کر رہی ہو۔

اگر یہ لڑکی مونچھیں نہ مونڈے اور انہیں بڑھا لے..... سے خوف نہیں آئے گا..... آپ بے ہوش نہ ہوں لیکن چند لمحات کے لیے آپ کے ہوش و حواس ضرور جواب دے جائیں گے..... آپ اپنے ہونٹوں پر انگلیاں پھیریں گے جہاں

مونچھیں منڈی ہوں گی..... مگر آپ کی صنف مقابل اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہی ہو گی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ لڑکی وک ایک نظر دیکھنے کیلیے پلٹا تو وہ موجود نہیں تھی۔

اس کا ذہن اس قدر مضطرب تھا کہ اس نے اپنا کام ملتوی کر دیا اور گھر چلا آیا اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر اس نے مزید سوچ وچار شروع کر دی۔

اس کو اس لڑکی پر بہت ترس آ رہا تھا..... بار بار وہ قدرت کی بے رحمی پر لعنتیں بھیجتا تھا کہ اس نے کیوں نسوانیت کے اتنے اچھے اور خوبصورت نمونے کو خود ہی بنا کر اس پر سیاہی کا لیپ کر دیا..... آخر اس میں کیا مصلحت تھی..... اب اس شکل میں اس سے شادی کون کرے گا..... قدرت نے کیا کوئی ایسا مرد پیا کر رکھا ہے جو اسے قبول کر لے گا..... لیکن وہ سوچتا کہ قدرت اتنی دور اندیش نہیں ہو سکتی۔

اس کی بہن آئی..... دوپہر ہو چکی تھی..... اس نے رشید سے کہا۔

''بھائی جان..... چلیے کھانا کھا لیجیے''۔

رشید نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور یوں محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر بھی بال ہیں۔

''سلیمہ.....''

''جی.....''

''کچھ نہیں..... لیکن نہیں ٹھہرو..... کیا تمہاری مونچھیں ہیں''۔

سلیمہ جھینپ گئی۔

''جی ہاں..... بال اگتے ہیں''۔

رشید نے اس سے پوچھا ''تو..... میرا مطلب ہے تمہیں الجھن نہیں ہوتی ان بالوں سے''۔

سلیمہ نے اور زیادہ جھینپ کر جواب دیا ''ہوتی ہے بھائی جان''۔

''تو انہیں تم صاف کیسے کرتی ہو..... بلیڈ سے''۔

''جی نہیں..... ایک چیز ہے جسے بے بی ٹچ کہتے ہیں..... اس کو تھوڑی دیر ہونٹوں پر گھسانا پڑتا ہے''۔

''تو بال اڑ جاتے ہیں''۔

''اڑتے وڑتے خاک بھی نہیں..... دوسرے تیسرے روز پھر نمودار ہو جاتے ہیں بڑی مصیبت ہے..... بعض اوقات آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں''۔

رشید نے پوچھا۔

''وہ کیوں؟''

سلیمہ نے دردناک لہجے میں جواب دیا۔

''تکلیف ہوتی ہے بہت..... جب بال اکھڑتے ہیں تو چھینکیں آتی ہیں..... اور چھینکوں کے ساتھ آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے..... معلوم نہیں اللہ میاں مجھ سے کن گناہوں کی سزا لے رہا ہے''۔

رشید نے تھوڑے توقف کے بعد اپنی بہن سے پوچھا ''تمہاری کسی اور سہیلی کی بھی ڈاڑھی اور مونچھیں ہیں''۔

''مونچھیں تو کئی لڑکیوں کی دیکھی ہیں پر ڈاڑھی میں کبھی کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھی..... ایک دو بال ٹھوڑی پر دیکھنے میں آئے ہیں جو وہ موچنے یا ہاتھ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں..... یہ آپ نے کیسی گفتگو شروع کر دی..... چلیے کھانا کھا لیجیے''۔

رشید نے کچھ دیر سوچا۔

''نہیں..... میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا..... میرا معدہ ٹھیک نہیں ہے''۔

رشید کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے بالوں کی پڈنگ کھائی ہے جو ہضم ہونے میں ہی نہیں آتی..... اس کے سارے جسم پر تیز تیز نوکیلے بال یوں رینگ رہے تھے جیسے خاردار چیونٹیاں۔

جب سلیمہ چلی گئی تو رشید نے پھر سوچنا شروع کر دیا..... لیکن سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا..... اس لڑکی کے چہرے کے بال تو دور نہیں ہو سکتے تھے اس امر کا رشید کو کامل یقین تھا لیکن پھر بھی وہ سوچے چلا جا رہا تھا..... جیسے وہ کوئی بہت بڑا معمہ حل کر رہا ہو۔

رشید کو داخلے کی درخواست دینا تھی..... اس نے بی کا امتحان راولپنڈی سے پاس کیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ لاہور کے کسی کالج میں داخل ہو جائے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کرے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلا جائے جہاں اس کے والد پرائمری کونسل میں پریکٹس کرتے ہیں۔

اس روز مونچھوں اور ڈاڑھی والی لڑکی کے باعث نہ جا سکا۔ دوسرے روز وہ بس سٹینڈ کے بجائے تانگے میں گیا..... اس نے چونکہ بی اے کا امتحان اچھے

نمبروں سے پاس کیا تھا اس لیے اسے داخلے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔

وہ ڈاڑھی مونچھوں والی لڑکی اب رشید کے دل و دماغ سے قریب قریب محو ہو چکی تھی..... لیکن ایک دن اس نے اس کو کالج میں دیکھا..... لڑکے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

ایک نے آوازہ کسا۔

''مسٹر حمیدہ.....''

دوسرے نے کہا۔

''ایک ٹکٹ میں دو مزے ہیں..... عورت کی عورت اور مرد کا مرد.....''

تیسرے نے قہقہہ لگایا۔

''عجائب گھر میں رہنا چاہیے تھا ایسی شخصیت کو.....''

اور وہ بیچاری خفیف ہو رہی تھی..... اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی..... رشید کو اس پر بہت ترس آیا..... اس کے جی میں آئی کہ آگے بڑھ کر ان تمام لڑکوں کا سر پھوڑ دے جو اس کا مذاق اڑا رہے تھے مگر وہ کسی مصلحت کی بنا پر خاموش رہا۔

جب لڑکے چلے گئے اور اس لڑکی نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں میں امڈے ہوئے آنسو خشک کیے تو وہ جرات سے کام لے کر اس کے پاس گیا اور بڑے ملائم لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''آپ یہاں کس کلاس میں پڑھتی ہیں''۔

اس نے تنگ آ کر کہا۔

''کیا آپ بھی میرا مذاق اڑانے آئے ہیں''۔

رشید نے اپنا لہجہ اور ملائم کر دیا..... ''جی نہیں..... آپ مجھے اپنا دوست سمجھ کر یقین کیجیے''۔

اس نے جس کا نام حمیدہ تھا..... نفرت کی نگاہوں سے رشید کو دیکھا۔

''مجھے کسی دوست کی ضرورت نہیں''۔

''یہ آپ کی زیادتی ہے..... ہر شخص کو دوست اور ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے..... میں اس وقت مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ کے مضطرب دماغ کو اپنی باتوں سے اور زیادہ مضطرب کر دوں..... ویسے میں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنا دوست سمجھ کر یقین کیجیے''۔

یہ کہہ کر رشید چلا گیا۔

اس کے بعد متعدد مرتبہ اس نے حمیدہ کو دیکھا۔ جو بی اے میں پڑھتی تھی سارے کالج میں اس کی ڈاڑھی مونچھوں کے چرچے تھے..... لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ لڑکوں کی آوازہ بازی کی عادی ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب میں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے چہرے پر کوئی بال نہیں ہے۔

وہ ہوسٹل میں رہتی تھی۔ ایک دفعہ وہ شدید طور پر بیمار ہو گئی دس پندرہ دن تک بستر پر لیٹنا پڑا..... رشید نے کئی بار ارادہ کیا کہ اس کی بیمار پرسی کے لیے جائے مگر اس کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ مشتعل ہو جائے گی کیونکہ اسے کسی کی ہمدردی پسند نہ تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ اس کی کشتی ٹوٹی پھوٹی جیسی بھی ہے اسے اس کے سوا اور کوئی کھینے والا نہ ہو..... لیکن ایک دن مجبور ہو کر اس نے چپڑاسی کے ہاتھ ایک رقعہ رشید

کے نام بھیجا..... جس میں چند یہ الفاظ مرقوم تھے۔

"رشید صاحب!

میں بیمار ہوں..... کیا آپ چند لمحات کے لیے میرے کمرے میں تشریف لا سکتے ہیں۔ ممنون و متشکر ہوں گی....."

حمیدہ رشید یہ رقعہ ملتے ہی ہوسٹل چلا گیا..... بڑی مشکل سے حمیدہ کا کمرہ تلاش کیا۔

اندر داخل ہوا تو اس نے پہلے یہ سمجھا کہ کوئی مرد جس نے کئی دنوں سے شیو نہیں کی..... کمبل اوڑھے لیٹا ہے..... مگر اس نے اپنا ردعمل ظاہر نہ ہونے دیا۔

چارپائی کے ساتھ ہی کرسی پڑی تھی۔ رشید اس پر بیٹھ گیا۔

حمیدہ مسکرائی۔

"میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ مجھے بخار کے باعث نقاہت ہو گئی ہے اور شیو نہیں کر سکی..... کیا آپ میرے لیے یہ زحمت برداشت کریں گے"۔

رشید نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا..... شیو کا سامان کھڑکی کی سل پر موجود تھا۔

کینٹین سے گرم پانی لا کر اس نے حمیدہ کے چہرے کے بال نرم کیے صابن ملا..... اچھی طرح جھاگ پیدا کیے اور پھر پانچ منٹ کے اندر اندر شیو بنا ڈالی۔

پھر تولیے سے اس کا چہرہ خشک کیا اور شیو کا سامان صاف کرنے کے بعد وہیں رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔

حمیدہ نے اپنا نحیف ہاتھ گالوں پر پھیرا.....اور پھر رشید سے کہا۔

"شکریہ....."

اب دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔

رشید نے ایم اے اور حمیدہ نے بی اے پاس کر لیا.....رشید کو فوراً بڑی اچھی ملازمت مل گئی۔

اب وہ ایک نہیں روزانہ دو شیو بناتا تھا۔

☆☆☆

اختتام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حصہ چہارم